قفس

احمد عثمانی

www.taemeernews.com

قفس

احمد عثمانی

انتساب

ڈاکٹر پیر محمد رحمانی

کے نام

جنھوں نے طب اور تعلیمی

دنیا میں شہرت پائی

اور

مجھ جیسے طالب علموں کو زیورِ علم

سے سجایا

www.taemeernews.com

© پرویز احمد عثمانی

ترتیب وتزئین : سجاد عزیز

کمپیوٹر کمپوزنگ : یونیورسل کمپیوٹرس، غیاث نگر، مالیگاؤں۔

Mob. 9372176335

سرورق : حنیف خان (یونیورسل کمپیوٹرس)

ناشر : جہانگیر آرٹ اینڈ پبلیکیشن، مالیگاؤں-423203

سن اشاعت : ۲۰۰۸ء

طباعت : الہدیٰ آفسیٹ پریس، 877، نشاط روڈ، اسلامپورہ، مالیگاؤں

قیمت : 100 روپے

زیر اہتمام : جہانگیر

☆ تقسیم کار ☆

- ☆ اطفال بک ڈپو، محمد علی روڈ، مالیگاؤں 423203
- ☆ کتاب دار، جلال منزل، 108/110، ممبئی سماچار اسٹریٹ، ممبئی نمبر 9۔
- ☆ سلیم جہانگیر، 1۔ نیا پورہ مالیگاؤں۔ 423203

Mob.9270081843

- ☆ شب خون کتاب گھر، 313، رانی منڈی، الہٰ آباد، -211003
- ☆ مکتبہ جامعہ، ممبئی، دہلی اور علی گڑھ۔
- ☆ مکتبہ کوہسار، 3 بھیکن پور، بھاگل پور، بہار۔

www.taemeernews.com

ترتیب

1	کشمکش	9
2	شکست	15
3	معاشرت	18
4	ایم گاؤں کا ایلی	25
5	جلوس	29
6	اسیر بازگشت	32
7	اضطراب	37
8	اندھیرے سے الجھتی روشنی	42
9	مسیحا	49
10	قفس	52
11	ایک لوفر	56
12	ماضی	64
13	واہمہ	72
14	ایک سوچ	77
15	بشیرا	83
16	یادوں کے بھنور	88
17	غنی نواز	94
18	رونے کی آواز	99
19	عکس نما	106
20	کہکشاں	108

www.taemeernews.com

عرضِ ناشر

پھونس کے چھپر سے راج محل کے ایوانوں تک
دھول اڑاتی پگڈنڈیوں سے ہنگامے جگاتی شاہراؤں تک
مَدھ ماتی فضاؤں سے جلتے جھلساتے صحراؤں تک
کاسۂ گدائی سے درہم و دینار کے انبار تک
زمین کی نیرنگیوں سے خلاؤں کے چُپ کدوں تک
ریزہ ریزہ خوابوں سے تعبیروں کی تجسیم تک
جلوسِ یاراں سے تنہائی کے عذابوں تک

اور جانی پہچانی منزلوں سے انجانی رہگذاروں تک محترم احمد عثمانی صاحب کا قلم بہ وسیلۂ ناول نگار، مبصر، صحافی، ادیب الاطفال اور افسانہ جیسی اصناف میں کامیابی و کامرانی سے جاری ہے۔

''قفس'' موصوف کی نئی افسانوی کاوشات کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے اپنی مٹی سے پیوست رہتے ہوئے نئی کھوج، نئی جُستجو اور نئی تلاش کا سلسلہ دراز کیا ہے۔

اب یہ اربابِ نقد و نظر کا فریضۂ خاص ہیکہ اپنے ادبی ذوق و شوق کی تسکین کیلئے ''قفس'' میں مقید افسانوں کو نویدِ رہائی دیں۔ بہ صد شکریہ غالبؔ

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

www.taemeernews.com

دیانت دار ادیب

بلدیو شانت
دہلی

حضرات!

آپ دانش مند ہیں اور اسی وجہ سے بخوبی واقف ہیں کہ زندگی عبارت ہے۔ تاریکی اور اُجالے سے۔ سیاہ و سفید سے، جھوٹ اور سچ سے اور محبت و عقیدت سے۔ مجموعی طور پر انہی عناصر کی بدولت یہ وجود خاکی سالم و ثابت اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ جہاں تک احمد عثمانی صاحب کو میں ان کی تحریروں میں دیکھتا ہوں یہ سبھی اوصاف ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ ترقی پسند ہیں مگر ان کی ترقی پسندی محض اشتراکیت، بورژوائیت اور مساویت پر منحصر نہیں ہے بلکہ ان کا ادب فرسودہ رسم و رواج میں اُلجھے ہوئے انسانی ذہن کو تاریکی سے نکال کر اُجالے کی طرف لے جانے کا جتن کرتا ہے اور ایک دیانت دار ادیب کا یہی کام اور صحیح مقام ہے۔ ان کا ادب تقلیدی نہیں بلکہ واجبی رہبری کا حامی ہے تاکہ عام انسانوں کے لیے خوشگوار زندگی کے جلوے کی نشان دہی کی جا سکے۔ ان کو بزرگوں کی اطاعت کے ساتھ ساتھ قومی محبت، وطن سے عقیدت اور عزت و آبرو سے جینے کا صحیح مقصد نظر آ سکے۔ انسانی برادری کی برتری اس کے ذہن میں سما سکے۔

اگر آپ احمد عثمانی کو مجھ سے بہتر سمجھنا چاہتے ہوں تو ان کی کہانیاں یا پھر ان کے افسانے ''قفس'' میں پڑھیے تو میری تحریر کی تائید خود بخود ہو جائے گی۔

آپ جانتے ہیں کہ احمد عثمانی صاحب اُردو کے ہر دلعزیز و معروف ادیب ہیں۔ میں ان کی مزید ترقی کا خواہاں ہوں۔

www.taemeernews.com

اپنی بات

ادب کی تقسیم قدیم وجدید میں نہیں کی جاسکتی۔ادب ہر دور میں ترقی پذیر ہوتا ہے اسلئے ادب کو مختلف کیاریوں میں بانٹنے کی مخالفت ہونی چاہیے۔ جولوگ ترقی پسندی، غیر ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے عام قاری کی سمجھ سے عاری الفاظ استعمال کرتے نہیں تھکتے انہیں معلوم ہیکہ میر اپنے دور میں ترقی پسند تھے۔یہی بات ہم اس وقت کے نثر نگاروں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

پریم چند نے جب ''کفن'' لکھا تھا تو کیا اُس دور میں ادب کا کوئی منشور یا کوئی منصوبہ بندی تھی؟ ایسا کچھ نہیں تھا۔ پریم چند نے افسانے کا سنگِ بنیاد رکھا اور یہی افسانہ افسانے کیلئے سنگ میل ثابت ہوا۔

ادیب کے ذہن میں خیال ابھرتا ہے۔اس خیال ابھرنے کے لمحے کو ادیب پکڑ لیتا ہے اور اس لمحاتی خیال کو صفحۂ قرطاس پر الفاظ کی صورت میں اتار لیتا ہے۔اچھے اور برے کی بحث بعد کی ہے۔ اس میں تلاش وجستجو بھی شامل ہوتی ہے جو ادیب کا شعار ہے۔

خواجہ احمد عباس نے کہا تھا'' سماج میں بہت ساری کہانیاں بکھری پڑی ہیں ادیب کو چاہیے کہ ان کہانیوں کو ڈھونڈ نکالے''

زیرِ نظر مجموعے میں ایسی کہانیاں ہیں جو ہمارے سماج کا حصہ ہیں۔ان کہانیوں کو شائع کرنے کی جسارت اسلئے بھی ہوئی کہ مجھے اپنے ناول ''زندگی تیرے لئے'' سے حوصلہ ملا۔اس ناول کو عصرِ حاضر کے بیشتر معتبر ومشہور ادیبوں اور نقادوں نے سراہا۔ان میں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر نیّر مسعود، شمس الرحمٰن فاروقی، جتندر بلو، ساقی فاروقی، بشر نواز، جوگندر پال، ڈاکٹر معصوم شرقی اور بھی کئی لوگوں نے تعریف و توصیف کی۔انکے علاوہ میں جنکے لئے لکھتا ہوں وہ تمام عام قاری ہیں جو نا شاعر ہیں نا ادیب اور نا ہی نقاد انکی تعداد اچھی خاصی ہے۔وہ اچھے برے کی پہچان بھی رکھتے ہیں۔ایسے بہت سارے قاریوں نے لاقیمت الفاظ کے ذریعے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔شہر مالیگاؤں اور بیرون شہر کے ادب نوازوں نے میری ہمت اور حوصلہ بڑھانے کیلئے پذیرائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ایک بات اور بتانا چاہتا ہوں۔ چند لوگ جو قاری نہیں ہیں انہیں میری نثر اور بڑکھا بڑ معلوم ہوتی ہے۔(یہی الزام راجندر سنگھ بیدی پر بھی لگایا جاتا ہے) اسکے بارے میں عرض ہیکہ میری کہانیاں

www.taemeernews.com

سماج سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسکے کردار بھی سماج میں جینے والے لوگ ہیں۔ اگر میں لکڑ پھوڑ سلیم کی زبان حیدر آبادی یا لکھنوی لکھوں تو اس میں مصنوی پن آجائے گا۔ اور سلیم کا کردار نقلی معلوم ہوگا کہانی کی عزت وآبرو خطرے میں پڑ جائیگی اور لکھنے والے کا شعور ناپختہ کہلائے گا۔ اسکی زبان میری اپنی نہیں ہوگی بلکہ کسی کی چرائی ہوئی گلابی نثر معلوم ہوگی۔

میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں۔ اسکے بعد جن حضرات نے داد ے درے سخنے میری حوصلہ افزائی کی ان کا شکر گذار ہوں کیونکہ انہیں کے دم سے اردو زبان زندہ ہے۔ جب تک ایسے محسن اردو قاری زندہ رہیں گے اس وقت تک اردو زبان زندہ رہے گی۔ پھولے گی اور نئے شگوفے کھلیں گے۔ میرے دوست سجاد عزیز کا بے حد شکر گذار ہوں کہ انہوں نے ایک ایک لفظ کو پرکھا اور سلیم جہانگیر کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے اشاعت کا گراں بار اپنے کندھوں پر اٹھایا۔

میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''اپنے آپ کا قیدی'' بھی اعلیٰ حضرت الحاج ڈاکٹر پیر محمد رحمانی کی بین الاقوامی شخصیت کے نام معنون تھا۔ یہ مجموعہ بھی انہیں کے نام سونپ رہا ہوں، اعلیٰ حضرت نے مجھے زیورِ تعلیم عطا کیا اور قلم پکڑنا سکھایا۔

انجمن ارتقائے ادب، انجمن تہذیب الاخلاق، محبان ادب، عبدالقادر ایجوکیشنل سوسائٹی، ادارۂ احرار ہفت روزہ احرار (مالیگاؤں)، مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکاڈمی، بہار اردو اکاڈمی اور امیر حیدر اکیڈمی (گیا۔ بہار) جیسے اداروں کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میرے ادبی سفر کی تعریف کرتے ہوئے توصیفی اسناد، انعام واکرام اور اعزازات سے نوازا۔ وہیں ڈاکٹر سعید احمد فارانی، ڈاکٹر شفیق احمد انصاری، ڈاکٹر نذیر صدیقی، ہارون بی اے (مدیر بیباک)، سید عارف (مدیر جواز)، قاضی مشتاق، ڈاکٹر جاوید رحمانی، احتشام دیشمکھ، ڈاکٹر عرفان رحمانی، عتیق کمال (اسکول بورڈ چیرمن وکارپوریٹر)، نورالحسنین (اورنگ آباد)، ڈاکٹر عظیم راہی (اورنگ آباد)، ایڈوکیٹ یاسین مومن (بھیونڈی)، کامریڈ اسرار احمد انصاری (بھیونڈی)، ایڈوکیٹ نیلوفر اختر (ممبئی)، سازالہ آبادی (بھیونڈی)، عمران انصاری (مقیم چوپڑا)، نسیم خان وزیر خان، سید آصف علی نور علی، محمد انیس ٹارگیٹ اور عالیجناب شیخ رشید حاجی شیخ شفیع (ایم ایل اے) صاحبان کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میرے ادبی سفر کو کامیاب کرنے کی کوشش میں اپنا خلوص وتعاون شامل کیا۔

احمد عثمانی

www.taemeernews.com

کشمکش

میرے سامنے علی خان کھڑا تھا۔ گول چہرہ، چہرے پر سُرخی، اونچا پورا، روھیلہ۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اور اس کی بیوی دونوں میرے پڑوس میں رہتے ہیں۔ اس کی بیوی نے میری بیوی سے بھابھی کا ناطہ جوڑے رکھا تھا اور مجھ سے بھائی کا۔ اُس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا۔ شرافت وحیا کی پتلی۔ صرف دوپہر یا رات کے سناٹے میں جب گھر میں کوئی نہیں ہوتا تب وہ آتی۔ دونوں عورتیں دنیا جہان کی باتیں کرتیں۔ جب باہر کے کمرے میں، میں داخل ہوتا تو وہ پچھلے دروازے سے نکل کر اپنے گھر چلی جاتی۔

میری بیوی طاہر اُس کی بہت تعریف کرتی تھی۔ وہ پربھنی کے کسی دیہات کے روھیلہ خاندان کی تھی لیکن تھی بڑی دھان پان، بالکل کٹ پتلی کی طرح۔ یہ باتیں مجھے طاہر نے بتائی تھیں۔ علی خان کسی فیکٹری میں کول مین یا بائیلر مین تھا۔

میری عادت تھی کہ رات کا کھانا کھانے کے بعد قریب کے نکڑ تک جاتا۔ پان شاپ سے ایک وِلس سگریٹ لیتا، ہلکے ہلکے کش لگاتا اور دھیرے دھیرے گھر آجاتا۔ اس معمول میں برسوں سے کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی محلے کے لوگوں سے ملنا ملانا اور گپ شپ بھی ہو جاتی۔

آج بھی میں نکلا ہی تھا کہ بڑی دلگداز آواز نے مجھے متوجہ کرلیا۔ ''بھائی صاحب!'' میں نے مڑ کر دیکھا۔ علی خان میرے سامنے کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں نے سوچا اگر چاہتا تو نامی پہلوان بن سکتا تھا۔ اُس کی کاٹھی ایسی ہی تھی اور وہ لاٹھی کی طرح اونچا پورا بھی تھا۔ ہاتھ پاؤں کا مضبوط۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ''بولو کیا کام ہے مجھ سے۔'' وہ ذرا ہچکچایا۔ پھر دھیرے دھیرے ایسے بولنے لگا جیسے گہرے کنویں سے الفاظ کھینچ لا رہا ہو۔ میں نے ہمت بندھائی۔ ''بولو بھائی علی خان۔ کیوں ڈر رہے ہو۔ کوئی اہم کام ہے کیا؟'' اُس نے دھیرے دھیرے کہا۔ ''مجھے۔۔۔ مجھے۔۔۔ بیس روپیہ چاہئے۔ بچہ بیمار ہے۔۔۔؟'' وہ خاموش ہوگیا تو میں نے کہا۔ ''بس اتنی سی بات۔'' میں نے اُسے فوراً بیس روپیہ دے دیا۔ میری بیوی نے

www.taemeernews.com

بتایا تھا کہ اُس کا ایک بچہ بھی ہے۔ بڑا گل گوتھنا، بالکل گڈا، کسی کی بھی بیماری کا سُن کر میں تڑپ جاتا ہوں۔ پھر یہ تو بچے کی بیماری والا معاملہ تھا۔

علی خان گھر کی طرف مڑ گیا اور میں نکڑ پر آیا۔ سگریٹ سلگا کر واپس گھر آ گیا۔ طاہر سے بولا۔

''رئیسہ کا بچہ بیمار تھا تو تم نے بتایا نہیں۔'' وہ بولی۔ ''ابھی تو رئیسہ اُٹھ کر گئی ہے۔ بچہ تو اچھا ہے۔ آپ کو کس نے بتایا؟'' میرا ماتھا ٹھنکا۔ علی خان نے چال چلی ہے۔ خیر بیس روپے کی تو بات ہے۔ میں نے جان بوجھ کر طاہر سے یہ بات چھپائی کہ ناحق پڑوسی کے گھر میں بیس روپے کیلئے میاں بیوی میں لاکھوں الفاظ کی بک بک، جھک جھک ہوگی۔

سال چھ ماہ اوپر کی بات ہے۔ جب علی خان کے یہاں دوسرا بچہ آنے والا تھا۔ ایک دن طاہر نے بتایا کہ رئیسہ بہت پریشان ہے۔ اُس کے گھر والے نے فیکٹری کے مینیجر کی سائیکل کسی جواڑ خانے میں رہن رکھ کر رقم جوے میں ہار دی۔ کل مینیجر تلاش کرتے ہوئے آیا تھا اور کہہ گیا کہ دو دن میں سائیکل واپس نہیں ملی تو پولس میں چوری کی فریاد درج کرا دے گا اور چور کا گھر بھی بتا دے گا۔ آپ کچھ کیجئے۔ رئیسہ نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ اُس کا پیر بھی بھاری ہے۔ ایسے وقت اُس کے لئے رونا اور صدمہ کرنا اچھا نہیں ہے۔

''میں نے کہا تم رئیسہ سے کہو کہ وہ اُس کے شوہر سے پوچھے جوا خانہ کہاں ہے اور کتنے روپے میں سائیکل رکھی ہے خان صاحب نے؟'' طاہر ایسے انداز سے اُٹھی جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد مسکراتی ہوئی وارد ہوئی اور ایک کاغذ مجھے تھما دیا۔ لکھا تھا۔ ''بجرنگ واڑی روڈ، مہاراج کا اڈہ۔ ساٹھ روپے میں۔''

میں نے اپنی چوں چرا چک چی کرتی سائیکل اُٹھائی اور اڈے کی تلاش میں نکل پڑا۔ پیڈل مارتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ابھی تنخواہ ہونے میں ایک ہفتہ باقی ہے۔ مہاراج سائیکل کے بدلے سائیکل دے گا تو لے لونگا۔ پھر سوچا سائیکل کے بغیر تو میرا کام اٹک جائے گا۔ پھر نظر گھڑی پر پڑی۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ پانچ سو کی گھڑی وہ ساٹھ روپے میں رکھ لے گا۔ تنخواہ پر گھڑی چھڑا لوں گا۔ کسی کا کام تو بن جائے گا۔ الٹے سیدھے کام تو کرتا ہی رہتا ہوں۔ یہ کام بھی ہو جائے تو کچھ تو نیکی لکھی جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ سوچتے سوچتے سڑک پر پہنچ گیا۔

ایک دکاندار سے مہاراج کے اڈے کا پتہ پوچھا تو وہ سر سے پیر تک نوکیلی نگاہوں سے دیکھنے

www.taemeernews.com

لگا۔شاید مجھے پولس کا آدمی سمجھا ہوگا یا پھر جواری۔ کچھ سوچ کر اُس نے بتایا۔'' آگے ایک ہوٹل ہے۔اُس کے پیچھے چلے جاؤ۔چاروں طرف ٹاٹ سے گھیری جگہ ہے۔سمجھ لو وہی مہاراج کا اڈہ ہے۔''

ہوٹل کے پیچھے ٹاٹ کا بڑا سا شامیانہ تھا۔اُسے تین طرف سے ٹاٹ سے گھیر لیا گیا تھا۔ایک طرف ہوٹل کی دیوار تھی۔سائیکل کھڑی کر کے ایک جگہ جھولتا ہوا ٹاٹ اُٹھا کر میں اندر داخل ہوا۔جیسے ہی میں نے اندر نظر دوڑائی۔سامنے محلے کے ایک لیڈر تاش کے پتے پھینٹتے ہوئے دکھائی دیئے۔جب اُن کی اور میری نظر ملی تو اُنہوں نے پھینٹتے ہوئے پتے رکھ دئے اور جلدی سے میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔'' کچھ کام تھا تو مجھے کہہ دیتے۔آپ کیوں یہاں تک آئے؟'' تب تک مہاراج بھی آ گیا تھا۔میں نے اُس سے کہا۔''ایک آدمی علی خان نے تمہارے یہاں سائیکل گروی رکھی ہے۔میری گھڑی رکھ لو اور سائیکل دے دو۔''مہاراج نے میرے ہاتھ سے چمکتی ہوئی گھڑی جھٹ اپنے ہاتھ میں لے لی اور کسی چھوکرے کو پکار کر بولا۔''ارے وہ علی خان کی سائیکل لے آ۔صاحب کے ساتھ جا کر دے آ۔''

لیڈر جو بازو میں ہی کھڑے تھے۔مہاراج سے بولے۔''صاحب کی گھڑی دے دے۔میں تیرے پیسے ادا کر دوں گا۔'' مہاراج نے تھکے تھکے ہاتھ سے مجھے گھڑی واپس دیتے ہوئے ٹیڑھا میڑھا منہ بنایا۔

یہ واقعہ میں بھول چکا تھا لیکن آج پھر یہ واقعہ یاد آ گیا تو میں نے سوچا کہ یہ بیس روپیہ بھی گیا۔ اب پتہ نہیں، یہ علی خان کا بچہ کیا گل کھلاتا ہے، حالانکہ قلیل تنخواہ میں گذارا ہو جاتا تھا لیکن آسمانی سُلطانی آ ہی جاتی تھی۔کبھی کبھی بے وقوفی بھی ہو جاتی تھی۔ماضی میں بھی ہوتی رہی۔اب بھی ہوتی رہے گی۔

میرے پاس بہت سارے مواقع چل کر آئے۔دولت کمانے کے نہیں ہتھیانے کے، لیکن دل و دماغ نے ہاں کہی تو ضمیر نے سامنے اصولوں، آدرشوں کی تختی ابھار دی۔۔یہ غلط ہے۔۔غیر قانونی ہے۔۔ناجائز ہے۔

جب میری نئی نئی شادی ہوئی تھی اُس زمانے میں راشننگ شروع ہوئی۔کئی سستے اناج کی سرکاری دکانیں کھلیں۔سپلائی آفیسر سے راشن کارڈ بنوانے کے سلسلے میں کئی ملاقاتیں ہوئیں تو ملاقاتیں دوستی میں بدل گئی۔سپلائی آفیسر کو محلے میں بلوالیا۔دورہ کروایا اور مکانات کی فہرست دیکر فارم لے لئے۔ مفت میں پُر کر کے راشن کارڈ منظور کروائے۔تیار راشن کارڈ بھی لا کر محلے والوں میں تقسیم کر دیئے۔

ایک دن سپلائی آفیسر نے میرے گھر کھانا کھاتے ہوئے کہا۔''دیکھو! یہ راشننگ اور لائسنسنگ کا جماتا ہے۔اب گھاستیل کا بھی راشننگ ہوگا۔میں تم کو ایک چلر بکری کا لائسنس دیتا ہوں اور

www.taemeernews.com

روامیدہ بھی راشتنگ پر ملے گا۔ اُس کا بھی لائسنس دیا جانے والا ہے۔ وہ بھی تم لے لو۔"

میں نے کہا۔ "صاحب! یہ سب کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میں نوکری پیشہ آدمی، یہ سب کام مجھ سے نہیں ہوگا اور نا مجھے ضرورت ہے۔" سپلائی آفیسر کاپسے نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی سے رشوت چالو ہوگئی۔ ایک لائسنس کا دس ہجار۔ تم کو میں پھری دے رہا تو تم نہیں لے رہا۔ ارے آج نہیں تو کل یہ کام آنے والا ہے۔ تم بیٹھے بیٹھے کمائے گا۔ کسی کو بھی لائسنس دے دے گا تو سال کا دس بیس ہجار ملے گا۔"

اندر سے میرا ضمیر ٹھوکے دے رہا تھا۔ میں نے انکار میں گردن ہلائی۔ کاپسے مسکرایا اور بولا۔ "تم باؤلا ہے۔ ارے بابا! اپنے لئے نئی تو آنے والے بچو کیلئے تو کچھ کرو۔ ڈیڑسو روپلی میں کیسے گجارا کرے گا؟" کاپسے مجھ سے اس لئے متاثر تھا کہ میں اپنی ڈیوٹی کے بعد بہت سارے عوامی کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ زیادہ تر القہ کاپسے سے ہی پڑتا تھا۔

اُس وقت یہ ڈیڑھ سو روپے میرے لئے بہت تھے۔ طاہر کفایت شعار تھی۔ مہینہ گذرنے کے بعد بھی تھوڑا بہت پس انداز کر لیتی تھی جو محلے کے لوگوں کے کام آتا۔ کسی نے واپس لوٹایا تو ماشاء اللہ۔ نہیں لوٹایا تو سُبحان اللہ۔ زندگی کی گاڑی تو برابر رواں دواں تھی۔ کبھی کبھی سوچتا یہ بے وقوفی ہے کہ آنے والی دولت کو لوٹا دیا جائے لیکن یہ سوچ صرف لمحہ بھر کیلئے اُبھرتی۔

ایک بار ایک لڑکے کو ملازمت دلا دی۔ اُس کا بھائی دس ہزار روپیہ لے کر آیا۔ بہت اصرار کیا کہ میں دس ہزار روپیہ لے لوں۔ اُس نے خوش آمدانہ لہجے میں کہا۔ "جہاں بھی جاتا تھا پچاس ساٹھ ہزار سے کم نہیں مانگتے تھے۔ آپ کی سفارش کی وجہ سے صرف قابلیت پرکھی گئی۔ پیسہ لگا کچھ بھی نہیں لگا۔ اس لئے یہ دس ہزار روپیہ آپ رکھ لیجئے۔"

یہاں بھی دل و دماغ پسیجنے لگے لیکن حضرت ضمیر نے میرے اور روپے کی گڈی کے بیچ سختی ابھار دی اور سختی سے منع کر دیا۔ دل و دماغ کی مات ہوئی اور ضمیر کی فتح۔

ایک بار بلدیہ کا انتخاب تھا۔ ایک پارٹی کے صدر نے بلایا اور کہا۔ "آپ کے وارڈ سے کوئی مناسب اُمیدوار دستیاب نہیں ہے۔ پارٹی آپ کو ٹکٹ دینا چاہتی ہے اور الیکشن کا خرچ بھی۔ آپ الیکشن لڑیئے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میری ملازمت کا کیا ہوگا؟"

صدر صاحب نے جھٹ کہا۔ "جب آپ منتخب ہو رہے ہیں تو ملازمت کی کیا ضرورت؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "کھاؤں گا کیا؟"

www.taemeernews.com

وہ بڑے غصے سے ہنسے اور بولے۔ ''ارے بھائی! تم خود اتنا کمالو گے کہ تمہیں کبھی نوکری کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جائی گی۔''

اُن کی حکیمانہ بات میرے پلے نہیں پڑی۔ میں انکار کر کے چلا آیا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر یہ بے وقوفیاں نا کرتا تو آج ایم۔ ایل۔ اے۔ یا ریاست میں وزیر یا ایم۔ پی۔ ضرور ہوتا۔ میرے سامنے کتنے جاہل مطلق ۔۔ نکمے ۔۔ بدحال ۔۔ سیاست کے سمندر میں کودے اور موتی نکال لائے۔ ایسے کہ اُن کی سات پیڑھی تک کے لئے زادِ راہ ہوگئی۔ اُن کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے راتوں رات محلوں میں تبدیل ہوگئے۔ چرمراتی سائیکل کی جگہ بائیک نے یا چمچماتی موٹروں نے لے لی۔ میرا جھونپڑا میری طرح مطمئن اور پُرسکون ہی کھڑا رہا۔ دن تو پُھر پُھر اُڑے چلے جارہے تھے دو وقت کی چوٹی چٹنی کے بجائے دال روٹی مل ہی جاتی تھی۔ تن بھی اُجلا اُجلا ڈھک جاتا تھا۔ ضمیر بھی پُرسکون اور مطمئن تھا۔ ایسے میں پھر ایک واقعہ یاد آ گیا۔

ماہِ رمضان کی چاند رات تھی۔ میں نے دو بجے رات کو بازار کا آخری پھیرا لگایا۔ سامان گھر میں رکھ کر میں سگریٹ لینے نکڑ پر جارہا تھا کہ علی خان نے پکارا۔ ''بھائی صاحب!''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ علی خان کی آنکھیں اور ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ اُس کے چہرے سے فتح مندی جھلک رہی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور سڑک پر سے گلی میں لے آیا اور کہنے لگا۔ ''آپ کو کتنے روپے چاہئے؟'' آواز ایسے کھنکتی تھی جیسے نو دو لیتے کی ہوتی ہے۔ اُس نے پتلون کی جیبوں سے نوٹوں کے بنڈل نکالے اور بولا۔ ''اور بھی ہے۔'' اُس نے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے نوٹ کے بنڈل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ لے لو۔''

''اتنے پیسوں کا میں کیا کروں گا تم ہی رکھو اور بچے کیلئے کپڑے، اور بیوی کے لئے کپڑے اور زیور لے آؤ۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ وہ بہت اصرار کرنے لگا۔ بہت ہی ادب و لجاجت سے کہنے لگا۔ ''لے لیتے تو اچھا ہوتا۔ کچھ تو لے لیجئے۔'' مجھے یاد آیا۔ ساٹھ اور بیس اَسّی روپئے اُس کی طرف باقی ہیں۔ میں نے کہا۔ ''اچھا! تم اَسّی روپیہ دے دو''۔ اُس نے سو کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوتا آپ یہ پیسہ لے لیتے۔'' وہ جانے لگا تو میں نے اُسے روک کر بیس روپیہ واپس کر دیا۔ اندر کے کمرے میں رئیسہ اور طاہرا ایک دوسرے کو مہندی سے سجا رہی تھیں۔ میں باہر کے کمرے میں لیٹ گیا۔

صبح میں جب عیدگاہ سے واپس آیا تو طاہرا کا اُداس اُداس چہرہ دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ وہ میکے کی یاد میں کھوئی ہوئی ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ''آج عید کا دن ہے لیکن تمہارے چہرے پر اُداسی

www.taemeernews.com

ڈیرا جمائے ہوئے ہے۔کیا میکے کی یاد ستا رہی ہے؟"

میرے اتنا کہتے ہی اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ تارے ٹوٹنے لگے۔

میں نے کہا۔"بتاؤ بھی کہ معاملہ کیا ہے۔اگر میکے جانا ہے تو چلئے ابھی چلتے ہیں لیکن یہ رونا، دھونا خوشیوں میں زہر گھولنا اچھا نہیں۔وہ بھی عید کے دن۔"

میں نے اُسے گلے لگا لیا۔اُس کے اُمنڈتے جذبات کچھ پُر سکون ہوئے تو اُس نے کہنا شروع کیا۔

"معلوم ہے! رات بھر رئیسہ کے شوہر نے کیا گل کھلائے۔رات میں دو بجے کے قریب گھر آیا تھا۔بہت ساری نوٹیں لے کر۔پھر دو تین آدمی آئے اور اُسے بہلا پھسلا کر یہ کہہ کر لے گئے۔طاہر اُن کی ہو بہو نقل اُتارنے لگی۔"بھیڑو! تیری کسمت جورو پر ہے۔پھر ہونے تک تو لکھو پتی بننے والا ہے۔بیس پچیس ہجار تو مار ہی چکا ہے۔"

" علی بھائی جھانسے میں آگئے۔اُن کے ساتھ چلے گئے۔پھر پانچ بجے آکر رئیسہ کے سارے زیور لے گئے۔چھ بجے خالی جیب آکر پڑے ہیں۔رئیسہ بہت رو رہی ہے۔بچے کی پہلی عید ہے۔ماں بچے کو نئے کپڑے نہیں ہیں۔میں نے رئیسہ کو ایک نئی ساڑی اور بلاوز دے دیئے ہیں۔آپ ابھی بچے کیلئے کپڑے اور اُس کیلئے عید کا سامان لے آیئے۔" میں نے تھیلی اُٹھائی اور یہ سوچتا ہوا نکل پڑا۔اچھا ہوتا میں رات میں علی خان سے سارے روپئے لے لیتا۔دولت کی دیوی دولت لاتی ضرور ہے لیکن ہمارے میاں ضمیر اندر سے کود پڑتے ہیں میرے اور دولت کے بیچ ہمیشہ نو انٹری کی تختی لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اب ایسا موقعہ آیا تو میاں ضمیر کو شکست دے دوں گا۔۔۔۔

لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا۔موقعے بہت سارے آئے۔ہر موقعے پر وہی ہوا۔ہاتھ بڑھایا تو ہاتھوں میں لرزہ اُتر آیا۔آنکھوں کے سامنے بڑی سی تختی لہرانے لگی۔خبردار۔۔۔۔۔۔ ☆☆

www.taemeernews.com

شکست

اچانک دھماکہ ہوا۔ زمین ہل گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے قیامت کا صور پھونک دیا گیا ہو۔ چند منٹوں میں ہی زمین تپ کر سُرخ پیتل بن گئی۔ پانی دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ درخت سوکھ کر ٹھنٹھ بن گئے۔ جانور زمین پر ڈھ گئے۔ فضا میں تیرتے پرندوں کا پتا ہی نہیں چلا۔ اچانک دھماکے سے ساری فضا آلودہ ہوگئی۔ اس دھماکے کو زمین برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس لئے اس کا توازن ڈانوا ڈول ہوگیا۔ اُتھل پتھل، افراتفری، بھونچال مچا ہوا تھا۔ علاقے کے لوگ بھاگ رہے تھے لیکن اُن کے گرد اچانک دھماکے سے کہرا چھا گیا تھا۔ وہ کہرے سے نکلنے کی کوشش کرتے لیکن پھر واپس اپنی جگہ پر آجاتے۔ کہرے کی وجہ سے اُنہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ زمین کی طرح اُن کے جسم سے پانی دھواں بن کر اُڑ گیا تھا۔ اُن کے سروں کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ سوکھی زبانیں لپ لپ کر رہی تھیں۔ پیٹ پر باندھنے کے لیے پتھر بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ زمین بانجھ ہو چکی تھی۔ دانہ نام کی چیز دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی کہیں تحلیل ہو گئی تھی۔ زمین کا یہ ٹکڑا پوری طرح ماتم زدہ بن گیا تھا۔

دور بہت دور علاقے کی راجدھانی میں ہر طرف زعفرانی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ ایکدوسرے کو زعفرانی رنگ کی مٹھائیاں کھلا رہے تھے۔ ان کے بدن پر زعفرانی لباس تھا۔ اُن کی ہنسی بھی زعفرانی تھی۔ کچھ لوگ جو سنگھاسن پر بیٹھے تھے وہ اپنے اُلٹے ہاتھ کی دو اُنگلیاں اُٹھا کر وی کا نشان بتا کر فتح کو اسیر کر رہے تھے۔ کچھ لوگ اُنہیں مبارکباد دے رہے تھے لیکن کچھ لوگ ان کی زعفرانی ہنسی اور مٹھائیوں پر ماتم کر رہے تھے۔ اکیسویں صدی کو فتح کرنے کے ان کے جشن کی کھلی اُڑا رہے تھے۔ ریڈیو پر اکیسویں صدی کو فتح کرنے کی خوشی میں فتح کی دُھنیں بج رہی تھیں لیکن اُنہیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ٹی وی پر بار بار زعفرانی روشنی بکھیر کر دور بہت دور کی کہر آلود فضا کو چھپا چھپا کر بتایا جا رہا تھا کہ یہاں کی ہر چیز محفوظ ہے اور یہاں کی دُنیا پہلے جیسی ہی چل رہی ہے لیکن اس میں ٹی وی کی سرچ لائٹ ٹیم کو مسلسل ناکامی ہو رہی تھی۔ دھماکے کی جگہ بہت گہرا گڑھا بن گیا تھا۔ سرچ لائٹ کی روشنی اُس گڑھے میں غائب ہو جاتی

www.taemeernews.com

تھی جیسے یہ گڑھا نہ ہو قاتل کنواں ہو۔ گڑھے کو چھپانے کی کوشش کی جارہی تھی لیکن روشنی پڑتے ہی گڑھا منہ کھولے روشنی کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔

راجدھانی کی زعفرانی خوشی اُس علاقے میں پہنچتے پہنچتے اکیسویں صدی کا مذاق بن کر ماتمی چیخوں میں بدل جاتی تھی۔ ٹی وی ٹیم کی سرچ لائٹ زعفرانی روشنی میں ہنستے کھیلتے بچے، دودھ پلاتی مائیں ،تندرست مردوں کو تلاش کرتی رہیں لیکن اس روشنی کو بھی یہاں کا کہرا دھوئیں میں تبدیل کر دیتا تھا۔ علاقے کے لوگ زعفرانی روشنی کو بھی راجدھانی کا عذاب سمجھ کر اپنے نچوڑے ہوئے لاغر بدن کو اِدھر اُدھر دبکانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ بچوں کی دلدوز چیخوں کو سُن کر مائیں اُنہیں اپنی سوکھی چھاتیوں سے چپکاتی تھیں لیکن ان کی چیخیں مسلسل فضا میں بلند ہو کر کہرے اور دھوئیں میں گم ہو رہی تھیں۔

دھماکے سے کچھ دن پہلے یہ سارا علاقہ خوشیوں سے ہرا بھرا تھا۔ مرد مضبوط بدن تھے۔ عورتوں کی چھاتیاں دودھ سے بھری ہوئی تھیں۔ اُن کے چہرے پر گلابی رنگ بکھرا ہوا تھا۔ اُنہیں کسی قسم کی فکر نہیں تھی۔ ان کی زمینیں فصلیں اُگلتی تھیں۔ وہ دُنیا کے نت نئے میلوں میں خوشحال تھے۔

دھماکے سے کچھ دن پہلے یہاں لاؤڈ اسپیکروں کا شور مچا تھا۔ ''اپنی قیمتی ووٹ اس نشان کو دیجئے۔ مہر اس نشان پر لگایئے۔'' اس شور کے زمانے میں ایک گول مٹول چہرے والا صحت مند گورا گورا بوڑھا آدمی آیا۔ اس کے کپڑے تو سفید تھے لیکن گلے میں زعفرانی رنگ کا پٹہ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے بڑی لچھے دار باتیں کی تھیں۔ اُس کی باتوں میں آ کر لوگوں نے اُسے اپنا مسیحا سمجھ لیا تھا۔ اس کی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے لوگ ایکدوسرے سے کہتے۔

''زمین پہلے فصلیں اُگلتی تھی اب نہروں کا جال بچھ جائے گا تو سونا اُگلے گی۔'' اُس آدمی نے علاقے کے مردوں کے گلے میں زعفرانی پٹہ ڈال دیا تھا اور عورتوں کے بدن پر زعفرانی ساڑیاں لپیٹ دی تھیں۔ لیکن کیا ہوا؟

نہروں کا جال اور زمین کے سونا اُگلنے کی بات تو دیو مالائی کہانیوں کا حصہ بن چکی تھی۔ اب تو اُن کے پانی سے لبریز کنویں بھی اندھے کنویں بن گئے تھے۔ ساری زمین تپ کر پیتل بن گئی تھی۔ زمین سے آسمان کی طرف مسلسل دھواں اُٹھ رہا تھا۔ کہر آلود فضا میں تمام چیزیں چھپ گئی تھیں۔ لوگ باگ محسوس کر رہے تھے کہ اُن کا بدن بھی آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا ہے۔۔۔ دھیرے دھیرے اس علاقے کا ماتم دھرتی پر پھیلنے لگا۔

راجدھانی میں جب یہ ماتم پہنچا تو اکیسویں صدی کو فتح کرنے کا دعویٰ کرنے والے لوگ بھی

www.taemeernews.com

اپنے آپ کو کنگال محسوس کرنے لگے۔ اس دھماکے نے اُن کی ساری پونجی اُڑا دی تھی۔ اُن کے ساتھیوں نے اُن سے نظریں پھیر لیں۔ اُن کا سنگھاسن ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سنگھاسن کو پکڑے بیٹھے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ راج سنگھاسن سے گر کر اپنے اپنے سنگھاسن کھو دیں گے اسی لئے وہ پوری طاقت سنگھاسنوں کو پکڑنے میں صرف کر رہے تھے اور علاقے کے ماتم کا ذمے دار اپنے پڑوسیوں کو ٹھہرا رہے تھے لیکن ان کی آوازیں اتنی کھوکھلی تھیں کہ راجدھانی کے باسیوں کے کانوں کو چھوئے بغیر سروں پر سے گذر جاتی تھیں۔ لوگ باگ ایکدوسرے کا منہ تکتے کیونکہ یہاں بھی دھیرے دھیرے کہرا چھا رہا تھا اور چیزیں کہرے میں گم ہو رہی تھیں۔ لوگ اس مصیبت کو دھماکے کی دین سمجھ رہے تھے، اور ذمہ داروں کو بے لاگ سُنا رہے تھے ان کی آواز میں دم تھا۔

دھماکے کے کئی دنوں بعد دور بہت دور دھماکے کے علاقے میں سورج نے آنکھ کھولی تو لوگوں نے دیکھا کہ اُن کے بالکل قریب موت کا کنواں بنا ہوا ہے۔ اس کنویں میں زعفرانی ہنسی پھوٹ رہی تھی۔ لوگوں کو محسوس ہوا کہ دھماکے سے کنواں بنانے والے اُن کے ماتم پر ہنس رہے ہیں۔

علاقے کے کچھ باہمت لوگوں نے ایکدوسرے کو آوازیں دیں۔ انسانی آوازوں کو پہچان کر کونے میں دبکے ہوئے مریل سے انسان باہر نکلے۔ ان کے گلے میں پڑا ہوا زعفرانی پٹہ تار تار ہو کر جھول رہا تھا۔ عورتوں کے بدن پر لپٹی ہوئی زعفرانی ساڑیوں کا بھی یہی حال تھا۔ جب سب لوگ جمع ہوئے تو اُن کی بربادی پر کنویں سے پھوٹنے والی زہریلی زعفرانی ہنسی انہیں کھلنے لگی وہ مذاق اُڑانے والی اس ہنسی کو دبا دینا چاہتے تھے۔ ایکدوسرے سے پوچھتے۔ ''کیا کرنا چاہئے؟'' اسی درمیان ایک مریل سے بوڑھے نے اپنے گلے میں پڑا ہوا تار تار زعفرانی پٹہ اُتار کر کنویں میں پھینکا۔ لوگوں نے حیرت سے دیکھا۔ انہیں محسوس ہوا پٹہ پھینکتے ہی زہریلی ہنسی کی آواز دب گئی ہے۔ تمام مرد اپنے اپنے پٹے اُتار کر پھینکنے لگے۔ عورتوں نے جب دیکھا کہ مرد زعفرانی پٹہ دھماکے سے بنے کنویں میں پھینک رہے ہیں تو اُنہوں نے بھی اپنی اپنی ساڑیاں کنویں کے منہ پر پھینک ماری۔ کنواں دھیرے دھیرے پٹنے لگا۔ اِدھر کنواں پٹ رہا تھا اُدھر لوگ محسوس کر رہے تھے کہ اُن کا بدن ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے غلامی کا زعفرانی پٹہ اُتار کر پھینک دیا ہے۔ اُنہیں ساری فضا آزاد محسوس ہونے لگی۔ اب کہرا بھی دھیرے دھیرے کسی اور علاقے کا رُخ کرنے لگا تھا۔ سورج بھی نئے موسموں کیلئے پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

چند دنوں بعد پڑوس کے علاقے سے پھر ہلکے دھماکے کی آواز آئی۔ لوگ ایکدوسرے سے کہتے۔ ''پتہ نہیں ان بیچاروں پر کیا قیامت گذری ہوگی؟'' ☆☆☆

www.taemeernews.com

معاشرت

جی میں آیا۔ اُس کے منہ پر دو تین جمادوں لیکن اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا۔ پاجی، نا ہنجار، نا خلف، بدتمیز، بے ہودا، گدھا اور..... نا جانے کیسے کیسے غیر شائستہ، نا مہذب الفاظ کی برات ذہن میں اضطراب پیدا کرنے لگی۔

میں نے اُسے شریف آدمی سمجھ کر پوچھا تھا۔ ''جناب! میں اس شہر کی معاشرت جاننا چاہتا ہوں۔'' بس اتنا ہی۔ اُس نا ہنجار نے بائیں آنکھ ایسے دبائی جیسے ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں بجلی بند ہوتی ہے تو بلب بلبلا کر جھپکی مار کر حاضرین کو متحیر کر دیتا ہے۔ پھر میری طرف یوں جھکا جیسے کوئی راز کھولنا چاہتا ہو۔ ''کہاں رہتی ہے ماسرت؟ نام تو نیا مالوم ہوتا ہے۔ اے بھائی! تم ہی بتلاسو۔ ہم کو بتا دیجو۔ دیکھن ما کیسی لگتی ہے؟'' میں نے اُسے بتانا فضول سمجھا کہ یہ کسی عورت کا یا شہر رقاصہ کا نام نہیں ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے اُس کا بے ہنگم قہقہہ صوتی آلودگی کو خاصا متاثر کر گیا۔

ذہن میں نا جانے کیا کیا کلبلانے لگا۔ بلا کسی سوچ کے بھٹک رہا تھا۔ ذہن میں شہر کھٹک رہا تھا۔ راستے میں ایک حولدار مجھے کراس کر گیا۔ سوچا کہ اُس سے پوچھ لوں پولس کو تال پاتال کی خبر ہونی چاہیے لیکن ذہن میں آیا کہ آج کل پولس تو بالکل مفت کی جیب بھرتی ہے۔ اُس کا سارا نظام خبریوں پر انحصار کرتا ہے۔ جب تک خبری خبر لاتا نہیں، پولس کی اوپر والی کمائی سے جیب بھرتا نہیں، تب تک پولس کی جیپ ہلتی نہیں۔ میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ اُبھری اور ذہن میں وہی نا خلف، نا ہنجار الفاظ کی سات پشتوں سے اپنا رشتہ ملانے لگے۔ حالانکہ اس طرح ناشائستگی کو میں نے دہشت گردی کی طرح ہمیشہ ناپسند کیا۔ کسی کو گالی گلوچ دینا یا برا بھلا کہنا میرے نزدیک ذہنی دہشت گردی ہے۔ یہی سب کچھ میں الجھا پارک پہنچ گیا۔

ایک بینچ پر سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک صاحب بڑے ہی پروفیسرانہ انداز سے تشریف فرما تھے۔ میں اُسی بینچ کے ایک سرے پر ٹک گیا۔ اُنہوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کسی شریر طالب علم سے سوال کر رہے ہوں۔ اب میرے اندر کی جیتابی نے تاب کھودی۔ میں نے ذرا سا کھسک کر کہا۔ ''میں

www.taemeernews.com

وارث علی ہوں۔ زمانے کی کھوج خبر رکھتا ہوں۔ جس کی کسی کو معلومات نہیں ایسے گڑھے مردے اکھاڑنا اور پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی عادت ہے مجھے۔"

وہ مسکرائے اور بولے۔ "میں پروفیسر پلٹانی ہوں۔ مقامی کالج میں پڑھاتا ہوں۔"

میں نے اپنی ہنسی کو دباتے ہوئے پوچھا۔ "اچھا! آپ کیا کیا اُلٹ پلٹ فرماتے ہیں؟"

اُنہوں نے پرجوش آواز میں کہا۔ "خاص طور پر تاریخ اور ادب۔"

"بھئی آجکل تاریخ کو اُلٹا پلٹا کرنے کا کام بہت سارے نام ونہاد ڈاکٹر اور جھٹ بھیّے سیاسی ورکر بڑے کروفر سے فرما رہے ہیں لیکن ادب پلٹنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

وہ کچھ جز بز نظر آئے کیوں کہ خاصی خنکی میں بھی اُن کی پیشانی پر بیزارگی کی علامت ننھے ننھے پسینے کی بوندیں اُبھر کر آئی تھیں۔ اُنہوں نے پوچھا۔ "کیا آپ نقاد ہیں؟ آجکل کے نقاد اسی طرح انٹرویو کرتے ہیں اور ایک مضمون ادبی رسالے والوں کو بھیج کر رقمطراز ہوتے ہیں کہ ایک اعلیٰ پائے کا مضمون ارسال خدمت ہے۔ اُمید کہ بار خاطر نا ہوگا۔ اور قارئین کیلئے لکھے گئے اس مضمون کو ضرور اولیت ملے گی وغیرہ وغیرہ۔" وہ میرے جواب کے انتظار میں ہنسی کو روکے نظر آئے۔ میں نے ذرا تامل سے جواب دیا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ بھلا میں فتنہ پرور، تعصب اور تفرقہ پھیلانے والا کام کس طرح کرسکتا ہوں۔ میں تو بہت شریف آدمی ہوں۔"

جب ہماری ہنسی تھمی تو میں نے سوال کیا۔ "آپ نے اُلٹ پلٹ کا مطلب نہیں بتایا کیا آپ اپنے اس کام کو اچھی طرح جانتے ہیں یا جس طرح نقاد ٹائٹل اور پیش لفظ دیکھ کر تبصرہ فرماتے ہیں۔ آپ بھی اسی طرح کام چلا لیتے ہیں۔"

پروفیسر نے بڑے گمبھیرانہ انداز سے اپنے نظریے کو بیان کیا۔ بات کرتے وقت وہ ایسے سنجیدہ ہوگئے تھے جیسے دُنیا کیلئے کوئی نئی چیز کھوج نکالی ہو لیکن میرے سامنے پرانی کہاوت منہ کھولے کھڑی تھی۔ "ہت تیرے کی۔ کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا!"

میں نے شرارت سے کہا۔ "ہوتا تو دکھائی دیتا نا۔ ناپید ہے اسی لئے دکھائی نہیں دے گا۔" وہ شریف آدمی کی طرح مسکرائے۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں جناب کسی کٹکھنے نقاد کی طرح کاٹنے نہ دوڑیں۔ اُن کے مسکرانے پر میرا خدشہ دور ہوگیا پھر کہنے لگے۔ "بتائیے آپ کی کھوج خبر کس مرحلے میں ہے؟"

میں اُن کے ہونے نا ہونے میں اُلجھا تھا۔ اپنے وجود کو نا ہونے کے خانے میں ڈال چکا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے ہونے کو اِدھر اُدھر کر رہا تھا لیکن اُن کا یہ اُلٹا پلٹا میری سمجھ سے کوسوں دور تھا۔ میں

www.taemeernews.com

نے تنگ آ کر کہا۔ خیر ہونے نا ہونے کو غالبؔ کے حوالے کرتے ہیں۔ مجھے ایک مسئلہ درپیش ہے۔ آپ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔ نظریہ سازی کے دور میں پہنچ چکے ہیں۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔"

میری باتیں سُننے کے بعد پروفیسر کی پیشانی مل آلود ہو گئی۔ اُن کا چہرہ خفگی کے اثر سے متاثر نظر آیا۔ ہونٹ پھڑک پھڑک گئے۔ جیسے وہ کہنا چاہ رہے ہوں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں گھسیارہ دکھائی دیتا ہوں؟ بہت سے ڈگری یافتہ، ڈاکٹریٹ کا بہی کھاتہ لکھنے والے، صرف بغل میں کتاب دابنے والے، کھوکھلے ذہن والوں میں میں کچھ تو بلند ہوں۔ کچھ تو آگے بڑھ کر سوچتا ہوں، پیش کرتا ہوں، عوام پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ادب و تاریخ میں کیا بھونچال آتا ہے۔ اس کی ذمہ داری میری نہیں۔"

دھیرے دھیرے اُن کی پیشانی سے مل صاف ہوئے تو میں نے کہا۔" میں اس شہر کی معاشرت جاننا چاہتا ہوں۔

وہ ہنسے۔ پھر بڑے رازدارانہ انداز سے کہنے لگے۔" معاشرت جاننے کے وسیلے اب مفقود ہو چلے ہیں۔ پہلے معاشرت مجرا پیش کرنے والی نستعلیق شائستہ طوائفوں کے یہاں پیدا ہوتی تھی۔ رقاصاؤں کیساتھ پلتی تھی۔ پھر شہر کے معزز گھرانوں میں اُس کا داخلہ ہوتا تھا۔ اُس کے بعد وہ عام لوگوں میں پھیلتی تھی لیکن اب اُسے تلاشنا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اب چنڈوخانے بھی نہیں رہے، وہ باروں میں آپ کو ملے گی نہیں۔ دیسی داروں کے اڈوں پر کوشش کی جا سکتی ہے۔"

میں نے اُن کے ایک ایک لفظ پر کسی طالب علم کی طرح توجہ دی۔ اب سائے طویل ہو چلے تھے۔ اندھیرا اُجالے پر حاوی ہونے لگا تھا۔ ہم دونوں اُٹھے۔ وش کیا اور مختلف سمتوں میں چلنے لگے۔ میں ہونے نا ہونے میں اور پروفیسر میری معاشرت میں اُلجھے قدم اُٹھا رہے تھے۔ پھر وہی بے سمتی، وہی کھوج۔ جس طرح بے روزگار، روزگار کی تلاش کرتا ہے۔ کھوج، فکر، اُلجھاؤ، ذہنی شیرازگی۔ ہلکے ہلکے قدموں سے بے سمت بڑھ رہا تھا۔ منزل نانشان منزل۔ میل نا سنگِ میل۔ اچانک ایک وجود مجھے ہونے کا احساس دلا کر مجھ سے آگے نکل گیا۔ میں نے دیکھا وہ لہراتا بل کھاتا تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا، یہ میاں ضرور شراب خانے کی جانب گامزن ہیں۔ میرے قدم آپ ہی آپ اُس کے تعاقب میں اُٹھنے لگے۔ وہ ایک گلی میں مڑا۔ چند قدم چلنے کے بعد ایک کھلے دروازے میں داخل ہوا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ سامنے رت جگے کا منظر منتظر تھا۔

یہاں انسانوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ کوئی تنہا اپنے آپ میں اُلجھا تھا تو کہیں دو تین افراد میں

www.taemeernews.com

زوروں کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ کہیں پر بین الاقوامی سیاست، ممبئی پر ہونے والی بارش کی طرح شدت اختیار کر چکی تھی۔ آوازیں ہی آوازیں۔

''کیا ایم ایلے ہے بھیڑو۔ جب میں اُس کے یہاں گیا تو ڈنکا چری پہلے سے بیٹھا تھا۔ دل ہی دل میں بولا۔ ہو المفوا۔ پر میں نے ڈنکا کو آنکھ ماری۔ وہ بھی کسی کو مار کر ہی آیا تھا۔ ایم ایلے نے پوچھا۔ ''کیا پرابلم ہے؟'' میں نے جھٹ کہہ دیا۔ ''دادی کا انتکال ہو گیا۔ پھر رونے لگا۔'' ایم ایلے نے کہا ۔دوست، یہ لو پھمن دپھن کر دینا۔'' کڑ کڑاتے تین سو روپے۔ وہی تو چل رہے آجنکل بلکہ دوڑ رہے۔''

''سالا بش اِراک کا سارا تیل نکال لے گا۔''

''ارے یار اپنے گاؤں کا برا حال ہے۔ دھندہ پانی، پانی پانی ہو گیا۔ ہر طرف لفوے ہی لفوے گریب پس گیا۔ امیر بلڈنگ میں بس گیا۔ روشنی چھین لی اونچے میناروں......'' ''واہ واہ۔''

''تم کیا بولتیں سمجھ میچ نئی آتا نا دیکھو۔'' مجھے کیوڑے کا بن یاد آ گیا۔

''اجی کائے کو منہ لگتیں شہدوں کے۔ انو تو سارے زمانے کا رس نچوڑ کر پی لیے نا۔''

''تو کائے کو پھکر کرتا ہے۔ بولا نا بھائی کو بولے کا تو (چٹکی بجا کر) یوں تیرا املہ خلاص کرے گا۔ ام بولا نا دے گا تو دے گا۔ تیرا سب کام کرے گا۔''

''لیو! ای سسر تو ساری کی ساری بوتلیہ ڈکار لیئین۔ اب دوسر کا کا ہوئی۔ اے بھائی! تم لوگن سے ہم آجج آ گئے۔ روج پیت ہو۔ روج گڑ پڑ جات ہو۔ بھاری لاس ہم سے نا سنبھلے بھائی۔''

''اوجھڑی کو گھوس مت سمجھو۔ بھگوئے کو دوس مت سمجھو۔ وا بھائی وا۔

''سو سانپ پال لینا ایک عورت مت پالنا۔''

''نور ہی نور پھیل گیا مئے خانے میں۔ کیا نور ہی نور پھیل گیا مئے خانے میں۔

کس کی تصویر اُتر آئی ہے پیانے میں۔ واہ۔ واہ۔ مکرر مکرر''

اُس وقت کئی آوازیں اُبھریں۔ ''آجا میری جان۔ لالے کی جان۔ پی لے جام۔ کھالے پان۔''

میں نے مڑ کر دیکھا ایک نیم خاتون چٹک مٹک چلی آ رہی تھی۔

''سالا ابھی عورت کی برائی کر رہا تھا۔ اب بالم ہجڑے پر فریفتہ ہو رہا ہے۔ حرامی کہیں کا......''

کوئی گلاس پر ہی ٹھمکا لگا کر بے سری بھدی آواز میں گا رہا تھا۔ ''کوا کھائے ہیرے موتی۔ کب آؤ گے رام۔''

www.taemeernews.com

میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ایک آدمی تنہا بیٹھا تھا۔ ذرا صاف ستھرا تھا۔ میں اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد بات چیت کی ابتداء ہوئی.....

''آپ اس شہر میں رہتے ہیں؟''

''ردِعمل شدید تھا۔ آپ کی تو.....''

''بھائی تمیز سے.....'' میں نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

''تمیز ! ارے اُسے بھاگے ہوئے زمانہ بیت گیا۔ سالی چلی گئی اپنے یار کے ساتھ بہن.....تم نہیں جانتے اندر لگی ہے آگ۔ بھڑک رہی ہے۔'' اُس نے سینہ کوبی کرتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف جھک کر بولا۔ ''کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''بھائی تمہارے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ اندر کی آگ بھڑکانے کی ضرورت کیا ہے۔ دارو تو اُسے اور بھڑکا دے گی۔''

اُس نے بڑے دردناک لہجے میں کہا۔ ''بے وفا تمیز جینے نہیں دیتی، جالم جندگی مرنے نہیں دیتی۔ بن پیے سونے نہیں دیتی۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ جیسے ہوش میں آ گیا ہو۔ چند لمحوں بعد اُس نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے کہا۔ ''میں اس شہر کی معاشرت جاننا چاہتا ہوں۔''

اُس نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا جیسے میں نے عمر شریف کی طرح پاکستان کے لالو کھیت پر کوئی مزاحیہ بات کہہ دی ہو۔ پھر وہ تھم کر بولا۔ ''بھائی ہم تو ایک ہی میں پریشان ہیں۔ تم یہ ماسرت بی بی کہاں سے پکڑ لائے۔ سالی عورت جات بڑی بدماس۔'' پھر میری طرف جھک کر کان کے قریب کہا۔ ''یہ رہتی کہاں؟''

بن پیے ہی میرے خون میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ جی میں آیا لگا دوں سالے کو دو ایک ، میخانے کا خیال آتے ہی خون کا اُبال تھمنے لگا۔ نامراد بن پیے ہی لہراتے مے خانے سے نکلا۔

معاشرت جتنی دور ہوتی جا رہی تھی۔ کھوج کی جڑیں ذہن میں اتنی ہی گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ ذہن میں الفاظ آپ ہی مچلنے لگتے۔

صبح آنکھ کھلی تو وہی معاشرت کی ڈور کھینچنے لگی۔ میں چہل قدمی کرتے کرتے ندی کے ساحل پر پہنچ گیا۔ ایک درخت کے نیچے دو آدمی چلم کشی کرتے نظر آئے۔ قریب پہنچ کر سلام کیا تو جواب بڑا پرخلوص ملا۔ پھر بیٹھنے کی دعوت دی۔

میرے بیٹھتے ہی ایک بولا۔ ''مال لائے؟''

''کیسا مال؟'' میں نے جواب دیا۔

www.taemeernews.com

''لڑتے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔ شکار پر جاتے ہیں مگر بندوق بھی نہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔'' دوسرا بولا۔ ''چھاج لینے آتے ہیں اور لوٹا چھپاتے ہیں۔ واہ واہ کیا بات ہے۔'' پھر وہ دونوں ہنسنے لگے۔

''چلو نکالو پڑیہ، مال بناؤ۔''

میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''بھائی! میں نے مے نوشی اور چلم کشی دونوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔ اب خودکشی کا ارادہ ہے لیکن پہلے شہر کی معاشرت جاننا چاہتا ہوں تاکہ دم دم سے نا نکلے ایک دم سے نکلے۔''

دوسرا ہنسا اور بولا۔ ''جب سر پھوڑنا ہی ٹھہرا تو اے سنگ دل تیرا ہی آستاں کیوں ہو؟'' پھر میری طرف جھک کر کہا۔ ''فلموں میں مکالمے لکھتے ہو؟''

''آپ کیا نغمہ نگاری فرماتے ہیں؟'' میں نے بھی سوال داغ دیا۔

''ہم دونوں بیکاری فرماتے ہیں۔ اب تو گریجویشن کی تاریخ یاد رکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ عمر رواں آگے رواں ہوگئی گریجویشن اور عمر کی تاریخ پیچھے، زندگی بسی موت کی جانب گامزن ہے۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔'' دونوں کا چہرہ بڑا متفکرانہ بن گیا تھا..... چند لمحے خاموشی نے کھا لئے اُس کے بعد ایک نے کہا۔ ''ہاں! وہ آپ کیا جاننے کی بات کر رہے تھے؟''

''میں شہر کی معاشرت جاننا چاہتا ہوں۔''

دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ لمحہ بھر کیلئے اُبھری۔ ایک نے کہا۔ ''ایک طرف قدیم بستی ہے۔ ایک جانب جدید جگمگی جھونپڑی۔ بیچ میں عوامی بیت الخلاء ہے۔ ایک طرف خواتین کیلئے ایک طرف صاحبین کیلئے۔ صاحبین کے بیت الخلاء میں آپ کو معاشرت کی تصویریں مل جائیں گی۔ با تصویر یا با الفاظ۔ سلام علیکم۔'' وہ دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے شہر کی جانب چلے گئے۔

میں نے بیت الخلاء کا رُخ کیا۔ ایک میں داخل ہوا۔ دروازہ پر لکھا تھا۔ ''بازو دیکھو۔'' بازو دیکھا تو لکھا تھا۔ ''پیچھے دیکھو۔ دیکھا تو لکھا تھا۔ ''آزو دیکھو'' آزو دیکھا تو لکھا تھا۔ ''ابے اِدھر اُدھر کیا دیکھتا ہے۔ سیدھے ہ.....'' مجھے ہنسی آگئی۔ ایک بیت الخلاء میں غلاظت کیساتھ پوری سیاست بھری تھی۔ ''دو بیلوں کی جوڑی ہے۔ ایک ہیرا ہے ایک موتی ہے۔'' اُس کے نیچے لکھا تھا۔ ''دو بیلوں کی جوڑی ہے ایک اندھا ہے ایک کوڑھی ہے۔'' ایک دیوار پر نوشتہ تھا۔ ''کھاؤ کھچڑا بھولو مت گائے بچھڑا۔'' ایک جگہ تازہ تازہ لکھا تھا۔ ''چارے والی سے نوٹ لو۔ پنجے کو ووٹ دو۔'' اسی طرح میں بیت الخلاء کی تفتیش کرتا گیا۔

www.taemeernews.com

ایک میں کسی ستم ظریف نے دروازے کے پٹ سے لے کر دیواروں اور کہیں کہیں چھت کو بھی داغدار کر دیا تھا۔ پورا کوک شاستر مثالی بنا دیا تھا۔ وہ بھی باتصویر۔ ایسا محسوس ہوتا تھا..... اس بیت الخلاء کا استعمال دوسرے بیت الخلاؤں سے زیادہ ہوتا ہے۔ ایک میں لکھا تھا۔ ''عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔ شانو آئی لو یو..... چلتی کیا کھنڈالہ۔'' ایک جگہ کوئی جلا بھنا رقمطراز تھا۔ یہ کالج نہیں کسال ہیں۔'' گڈمڈ تحریریں مختلف دیواروں پر جھلک رہی تھیں۔ ''وارڈ نمبر..... کا ممبر وارڈ نمبر..... کی ممبرنی کے گھر کیا کرتا ہے؟'' ''بلی سے شیلے کا چکر چل رہا ہے۔ پاکٹ مار ممبر بن گیا۔ (قوس میں) ایسوں کا ہی زمانہ ہے۔ سالا بڑا ایم ایل اے بنتا ہے۔ انگھوٹھا چھاپ۔''

اکل بند کی سرداری نکو۔ انگھوٹھا چھاپ کی گلامی بھلی۔ سالا کام بھی کرتا ہے گالی بھی کھاتا ہے۔ نوٹ لوٹتا ہے۔ پیسہ لٹاتا ہے۔

''کس کو تلاش کر رہے ہو..... اس کو..... وہ سبری کے یہاں ملے گا آدھی رات کے بعد۔''

چچا سام چھوڑو بیٹ نام۔ ہو جائے گا تمہارا کام تمام۔ ہو چی منہ زندہ باد۔ اقوام متحدہ امریکہ کی لونڈی ہے۔'' ایک کونے میں جگہ خالی تھی وہاں تازہ تازہ لکھا تھا۔ ایران کی طرف دیکھو گے تو ویران ہو جاؤ گے۔ آنکھ پھوڑ دی جائے گی۔ سمجھے شیطان بش۔ تمہارا بھس نکل جائے گا۔''

یہاں ایک فرق واضح تھا۔

کچے گھروں کی طرف سیاست حاوی تھی۔ پکے گھروں کی جانب بیت الخلاؤں میں الم غلم زیادہ تحریر تھا۔ ایسی تصویریں جو چوری چھپے دیکھی اور پڑھی جاتی ہیں اُن کا غلبہ تھا۔ صنفِ نازک کے ایسے ایسے خطوط اُبھارے گئے تھے کہ ایم۔ ایف حُسین دیکھتے تو فریفتہ ہو جاتے۔

اتنا سب جان لینے، دیکھ لینے کے بعد مجھے معاشرت پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری فضول محسوس ہوئی۔

پروفیسر پلٹانی بے ساختہ یاد آئے۔ ذہن میں اُن کی آواز گونجنے لگی۔

''جو دکھائی دیتا ہے وہ نہیں ہوتا۔ جو ہوتا ہے وہ دکھائی نہیں دیتا۔''

کیوں کہ بیت الخلاء کی بعض تحریروں اور تصویروں نے کھجراہو کی بت تراشی کو بھی شرما دیا تھا۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

ایم گاؤں کا ایلی

جب سورج ٹیکوے کی طرح کھڑا ہو گیا تو دھوپ کی انی ان کی پیٹھ پر محسوس ہونے لگی۔ تڑکے سے چر رہے تھے۔ اب اُن کے پیٹ بھر چکے تھے۔ اسلئے وہ قریب کے پاجھر تلاو کی جانب چل پڑے۔

پاجھر تلاو میں اُن سے پہلے کچھ بھینسیں اُتر چکی تھیں اُن کی پیٹھ پر سفید بگلے بیٹھے تھے۔ بھینسوں کے آس پاس کا پانی گدلا ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی پونچھ سے پیٹھ پر پانی اُچھال دیتیں تو بگلے پھدک کر اُن کے ماتھے پر پہنچ جاتے۔ جب وہ اپنا سر ہلا کر پانی میں گھسا دیتیں تو بگلے پھر پھدک کر پیٹھ پر آ بیٹھتے۔

جانوروں نے جی بھر کر پانی پیا اور اپنے ٹھکانے پر جگالی کرنے آ بیٹھے۔ یہ اُن کا معمول تھا۔ اُنھیں اُن کے مالک منہ اندھیرے کھول دیتے تھے وہ چراگاہ کی طرف چلے جاتے۔ لیکن کام کے جانوروں کو نہیں کھولا جاتا۔

جب اپنی جگہ نچنت بیٹھ کر اپنے آپ کو جگالی کیلئے تیار کرنے لگے تو اُس وقت میا کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اسکے چہرے پر دکھ کی لہریں آ جا رہی تھیں۔ ایک بچھڑی نے پوچھا ''میا کیوں آنسو بہاتی ہے؟'' میا بولی'' مجھے میرا جوکھو یاد آ رہا ہے اُسے مالک نے بیچ دیا ہے۔ اسکے ساتھ میرا پوتا بھی ہے۔ دونوں کی بہت یاد آتی ہے۔ پتا نہیں دونوں کس حال میں ہوں گے۔ جوکھو نے اور میں نے بہت سُہانے دن دیکھے ہیں۔

چند لمحوں بعد اسکی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے کیوں کہ وہ سنہری یادوں میں کھو گئی تھی۔

جب جوکھو اور وہ جوان تھے تو خوب چوکڑیاں بھرتے تھے۔ ایک بار مالک نے دونوں کے سینگ سے رسی باندھ کر پیروں میں باندھ دی تھی لیکن نیک بخت مالکن نے مالک سے کچھ کھسر پھسر کی تھی اس کے بعد مالک نے نہ صرف ان دونوں کے سینگ پیر کی رسی کھول دی تھی بلکہ آزاد بھی کر دیا تھا۔ ایسا کرتے وقت اس نے پیار بھری نگاہوں سے مالکن کی طرف دیکھا تھا مالکن اپنے منہ پر ساڑی کا پلو ڈال کر گھر میں دوڑ گئی تھی۔ آزاد ہوتے ہی وہ دونوں جنگل کی طرف دوڑ گئے اور پھر ایکانت میں جوکھو اس کو چوم

www.taemeernews.com

چاٹ رہا تھا وہ وہ جوکھو کو۔

اس کی سوچ یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ ڈکرانے کی آواز پر سب متوجہ ہو گئے۔ سونو میا کا پوتا خوشی سے کودتا، ڈکراتا چلا آرہا تھا۔ میا جوکھو کی خبر لینے کیلئے اُتاولی ہو رہی تھی۔ سونو سیدھا میا کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ وہ بہت دبلا اور کمزور ہو گیا تھا۔ اسکے بیٹھتے ہی میا نے اُس کا ماتھا چوما اور اپنی زبان سے اُس کی پیٹھ چاٹنے لگی۔ پھر پوچھا۔ ''تیرا دادا جوکھو ملا تجھے تھا۔''

سونو بولا۔ ''ہاں مائی۔ ہم دونوں ایک ہی جگہ بندھے تھے وہ جگہ بڑی گندی تھی۔ وہاں ایک اسکول بھی تھی۔ باہر سے سب دکھائی اور سُنائی دیتا تھا۔ ایک ماسٹر بڑا لہک کر کویتا پڑھا رہا تھا۔

مومن لوگ کیسے بولتے

موکے تو کے، تو کے موکے

دکھنی لوگ کیسے بولتے

تیرکو میرکو، میرکو تیرکو

ہندو لوگ کیسے بولتے

اکڑے تکڑے، تکڑے اکڑے

کویتا سن کر سب ہنسنے لگے لیکن مائی غصہ ہو گئی۔ بولی۔ ''کیا فالتو بکھان کر رہا ہے۔ میں جوکھو کا پوچھ رہی ہوں اور تو دو پائے کی بات کر رہا ہے۔ ارے ان دو پایوں نے دھرتی پر بہت زیادہ اُدھم مچا رکھا ہے۔ نرکھ بنا دیا ہے۔ مورکھوں نے۔''

سونو کھسیانہ ہو کر بولا۔ ''جوکھو دادا اور میں پاس پاس بندھے تھے۔ ہمارا تو نمبر لگ جاتا مگر گاؤں کے ایک بوڑھے دو پائے نے خوب دھما چوکڑی مچائی۔ ساری دوکانیں بند تھیں۔ اس لئے ہماری جان بچ گئی۔ اس دن جھٹ پٹے کے سمئے اس دو پائے نے ایک جگہ خوب ہلڑ مچائی۔ اس ہلڑ بازی میں کسی شریر بچے نے مجھے اور جوکھو دادا کو کھول دیا۔ میں تو چوکڑیاں بھرتے ڈکراتے دوڑتا تھا۔ میرے پیچھے دو پائیوں کے بچے اودھم مچاتے دوڑ رہے تھے۔ جوکھو دادا اور میں اس ہلڑ بازی میں بچھڑ گئے۔ مجھے بڑی مشکل سے جنگل کا راستہ ملا۔'' وہ چپ ہوا تو میا رونے لگی۔ سب ساکت تھے۔ جیسے ان دونوں کے غم میں وہ بھی شریک ہوں۔

سورج ڈھلنے لگا تو وہ ایک ایک کر کے اُٹھے اور پھر سے اپنا پیٹ بھرنے لگے۔ میا بھی اُٹھی اور دھیرے دھیرے چرنے لگی۔ جب دھوپ نرم ریشم کی طرح برسنے لگی تو اُنہوں نے اپنے اپنے ٹھکانے کی

www.taemeernews.com

رف چلنا شروع کردیا۔ میا بوڑھی ناکارہ اور مالک پر بوجھ تھی۔ اس لئے اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ خود ہی دوسرے جانوروں کے بیچ جا کر بیٹھ جاتی۔

دوسرے دن سب چپ چاپ بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ اسی وقت اُنہوں نے دیکھا جوکھو تھکے تھکے قدم اُٹھا کر ان کی طرف آ رہا ہے۔ سب اُٹھنے لگے لیکن سب سے پہلے میا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی بوڑھی ہڈیوں میں جوکھو کو دیکھ کر پتا نہیں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی۔ سب نے خوش ہو کر جوکھو کو گھیر لیا۔ میا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔

جوکھو بہت کمزور اور ڈھیلا ڈھالا ہو گیا تھا۔ کئی دنوں سے اسے چارہ پانی برابر نہیں ملا تھا۔ وہ بیٹھ گیا۔ میا نے پوچھا۔ ''دوپایوں نے تمہیں کھانا پانی نہیں دیا کیا؟'' جوکھو کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس نے اپنی ساری قوت جمع کر کے کہا۔ ''وہ کیا دیتے ان کا دانہ پانی خود ہی ایک بوڑھے دوپائے نے بند کر دیا تھا۔ سارا گاؤں بوکھلایا بوکھلایا پھر رہا تھا۔ جیسے سب پاگل ہو گئے ہوں۔ کچھ تو ہمارا ماس نہیں ملنے کی وجہ سے اور کچھ ماس بیچ کر ہونے والی کمائی کی وجہ سے۔''

مائی بولی۔ ''اس دوپائے کا شکر گذار ہونا چاہیے۔''

جوکھو ذرا تیز آواز میں بولا۔ ''کاے کا شکر گذار۔ یہ سب دوپائے ایسے ہی ہوتے ہیں کچھ دن تک چلاتے ہیں۔ اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد پھر اپنی والی پر آ جاتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کچھ دن پہلے جناوروں کی کھال نکالنے والوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہماری کھال، ہماری ہڈیوں، ہمارے ماس کا دھندہ کرتے ہیں۔ یہ دوپائے بڑے دشٹ ہوتے ہیں۔''

''اب اس گاؤں کا اور گاؤں میں بکے جناوروں کا کیا ہوگا؟'' میا فکرمندانہ لہجہ میں بولی۔

جوکھو سے پہل سونو بول پڑا۔ ''کچھ تو ہماری طرح بھاگ آئیں گے۔ کچھ مرکٹ جائیں گے۔ میا تمہیں وہ قصہ یاد ہے نا کہ جو کچھ دن پہلے ہماری سنگت میں بیٹھ کر ایک دوپائے نے دوسرے دوپائے کو سنایا تھا۔ کھونٹی ٹھونک کا قصہ۔ ہوا یوں تھا کہ ایم گاؤں میں ایک ایلی رہتا تھا۔ بڑا بھانگڑی تھا۔ لوگوں کو ڈراتا رہتا تھا کہ وہ مرے گا بھی تو پڑوسیوں کو پھنسا کر مرے گا۔ مرتے وقت خود ہی کھونٹی اپنے جسم میں ٹھونک لے گا اور اڑوس پڑوس کے لوگوں کا نام بتا دے گا۔ یہ ایم گاؤں کا ایلی ایسا ہی دوپایہ لگتا ہے۔'' اس کی بات سن کر سب ہنسنے لگے۔ میا بولی۔ ''اگر وہ ملے تو میں اس دوپائے کا شکریہ ضرور ادا کروں گی کیونکہ اس نے میرے جوکھو اور سونو کی جان بچائی۔''

جوکھو بولا۔ ''نا۔ ایسا مت کرنا۔ وہ ایم گاؤں کا ایلی بڑا کائیاں ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ مطلب

www.taemeernews.com

ہوگا۔ بنا مطلب کے یہ دو پایہ نوالا نہیں توڑتا۔ ایسا ایم گاؤں کے لوگ اس کے بارے میں بتاتے ہیں۔"

ابھی ان کے قصے کہانیاں اور بھی چلتے لیکن ایک دم خاموشی چھا گئی کیونکہ کچھ لوگ رسیاں لے کر ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کیساتھ ان کے مالک بھی تھے جو مختلف چارپایوں کی طرف اشارہ کر کے نشان دہی کر رہے تھے۔

جوکھو بولا۔ "لو آ گئے وہ پھر ہمیں خریدنے کیلئے! شاید انہوں نے ایم گاؤں کو چھوڑ کر نیا بازار ڈھونڈ لیا ہے۔"

مائی بولی "ہمارا نصیب بھگوان نے ایسا ہی بنایا ہے۔ پھلو، جنو دو پایوں کیلئے دودھ دو اور آخر میں اپنے بچھڑوں کو کٹنے کیلئے چھوڑ دو اور خود پاؤں گھس گھس مرو۔

مائی کی آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگ چکی تھی۔ دوسروں کی بھی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ سلو بولا "مائی چنتا مت کرو ہاں بھی کوئی نہ کوئی ایلی پیدا ہوگا۔" جوکھو بولا۔ "مشکل ہے۔ ایسے کھوٹی ٹھوک جلدی پیدا نہیں ہوتے۔ سب بولتے ہیں کہ ایم گاؤں نرالا گاؤں ہے۔ یہاں محنت، گندگی دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مگر گاؤں کا ایلی نت نئی باتوں میں مگج پچی کرتا ہے۔" رنجیدہ ماحول میں پھر ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگے۔ پتہ نہیں وہ گاؤں پر ہنس رہے تھے کہ ایلی پر۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

جلوس

گنیہ کا اصل نام عبدالغنی تھا لیکن اُسے کوئی عبدالغنی پکارتا تو وہ متوجہ نہیں ہوتا، کیونکہ اُس کے کان گنیہ کی آواز کے عادی ہو چکے تھے۔ گنیہ کا لباس ہی اس کی کاہلی کا غماز تھا۔ میلی، کچیلی، لنگی جس کی تار جگہ جگہ سے پھٹی، بسر پسر کرتی ہوئی۔ میلی کچیلی قمیض، قمیض کا دامن چھلنی کی طرح چھیدوں سے بھرا تھا اس کی بیڑی پینے کی چغلی کھا رہا تھا۔ الجھے میلے بال، داڑھی بھی اسی طرح کی، آنکھیں باریک اور پیلی کیچڑ سے بھری ہوئی۔ وہ اکثر فنگا کیساتھ نظر آتا۔ دونوں ہم پیالہ، ہم نوالہ تھے۔ فنگا کا نام فقیر محمد تھا ان گنیہ کی طرح وہ بھی فنگا ہی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ دونوں ہم ج، ہم پیشہ یعنی بے روزگاری کو ماننے والے تھے۔ اس لئے دونوں میں گہری دوستی بھی تھی۔ دونوں دن کہیں نہ کہیں سے دو چار روپیہ حاصل کر لیتے تھے اور رام داس کے اڈے پر جا کر کچھ پی پلا لیتے تھے۔

شراب نوشی کے علاوہ ان کا ہر کام موسمی ہوتا تھا۔ شادی کا موسم ہوتا تو وہ محلے میں کسی نا کسی کے خوب ڈٹ کر کام کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے مراسم ہر اچھے برے سے ہو گئے تھے اور سب سے سلام تھی۔

ان کی گذر اوقات رازق کے رزق پر تھی۔ وہ سوچتے۔ "ضرورت کیا ہے مزدور کہلوانے کی سی کی غلامی کرنے کی۔" دونوں اپنی اپنی آزادی میں مست تھے۔

جب شہر میں وعظ کی مجلسیں ہوتیں تو دونوں وعظ ضرور سنتے اور کبھی کبھار جمعہ کی نماز بھی پڑھ تے۔ رمضان تو ان کیلئے حقیقی معنوں میں برکت کا مہینہ ہوتا۔ اس ماہِ مبارک میں ان کیلئے نعمتوں کے ان آتے۔ مہینے بھر وہ عبادت میں مشغول رہتے۔ ام الخبائث یعنی شراب کا خیال بھی دل میں نہ لاتے۔ مہینے میں اچھے کھانے کے علاوہ پھل فروٹ سے صحت کی خرابی بھی دور کر لیتے تھے۔ رنگ نکھر جاتا، چہرہ ل جاتا، دن رات روزے داروں کی خدمت اور مزاج پرسی میں لگے رہنے کی وجہ سے فطرے کے نام صی رقم جمع کر لیتے اور کپڑے بھی سلے سلائے مل جاتے اور لنگیاں تو اتنی مل جاتیں کہ برے وقتوں میں نہیں بیچ کر ضرورت پوری کر لیتے۔ ویسے ان کا برا وقت دوگانہ پڑھ کر مسجد سے نکلتے ہی شروع ہو جاتا۔

www.taemeernews.com

اب ان کا برا وقت ہی چل رہا تھا کہ شہر میں جھنجھناہٹ شروع ہوگئی۔ یوں ان کا موسم ہوگیا۔ ایک دن راستے میں سیٹھ جان محمد، جوان کے لیے جانو سیٹھ تھے، ملاقات ہوگئی۔ علیک سلیک کے بعد جانو سیٹھ نے کہا۔ ’’بھئی کہاں ہو تم دونوں؟ کام آپڑا ہے اور دونوں غائب ہو۔ چلو آج سے کام پر لگ جاؤ۔ ہری جھنڈیاں بنانی ہیں۔ پورے محلے کو سجانا ہے۔ یہاں گیٹ بنانا ہے۔‘‘

جانو سیٹھ محلے کی جلوس کمیٹی کے صدر تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے ہاتھ میں چندے کا کام لے کر باقی تمام کام گنیہ اور فکا کے ذمے کر دیا۔ دونوں نے دل کھول کر پھریرے، جھنڈیاں اور پھول بنائے۔ چار کے بجائے آٹھ کا خرچ بتایا لیکن سب سے پہلے جانو سیٹھ کا ہی محلہ سجا۔ اس طرح گنیہ اور فکا نے کچھ دنوں کا سہارا کر لیا۔

جس دن جلوس نکلنا تھا، اس سے ایک دن پہلے دونوں نے خوب محنت کی۔ رات میں بھی ان کے لیے کام ہی کام تھا۔ رات بھر دونوں جلوس میں شریک ہونے والوں کے ہاتھوں میں پکڑنے والی ہری ہری جھنڈیاں بناتے رہے۔ اس دوران دونوں دم بھی مارتے اور میٹھی میٹھی چائے بھی پیتے رہے۔ علی الصباح جانو سیٹھ آئے تو ان کے پاس بِلّے (بیج) بھی تھے۔ جن پر گنبد و مینار کی رنگین تصویر چمک رہی تھی۔ ان میں کچھ خاص بِلّے بھی تھے۔ دو بِلّے ان کو بھی ملے اور اسی مناسبت سے خاص جھنڈے بھی ملے۔ ریشمی جھنڈوں پر سنہرا کام کیا ہوا تھا۔ اللہ اکبر اور کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ دونوں نے اسی وقت بِلّے قمیص کی جیب کے اوپر لگا لیے اور بچوں میں جھنڈیاں تقسیم کر کے ایک چھوٹا سا جلوس بھی نکلوا دیا۔ گویا یہ جلوس ایک ٹرائل تھا بڑے جلوس کا۔ کچھ دیر بعد ہی محلے کے تمام لوگ جمع ہو گئے تو جانو سیٹھ کو بلوایا گیا۔ جانو سیٹھ کے آتے ہی اُن کی قیادت میں محلے کا یہ جلوس مرکزی جلوس میں شامل ہونے کیلئے چل پڑا۔ جب محلے کا یہ چھوٹا سا جلوس مرکزی جلوس میں شامل ہوا تو جیسے وہ اس میں گم ہوگیا۔ انسانوں کا سمندر تھا کہ لہریں مار رہا تھا۔ جہاں تک نگاہ انسانی سر ہی سر تھے۔ جب نعرہ تکبیر بلند ہوتا تو فلک میں جیسے شگاف پڑ جاتا، زمین تھرانے لگتی۔ مارے جوش کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے۔ جلوس جب شہر کی شاہراہ پر آیا تو میلوں لمبا دکھائی دیا۔ جلوس چل نہیں رہا تھا بلکہ رینگ رہا تھا۔ گنیہ اور فکا دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دونوں نعرے لگا رہے تھے۔ جلوس جس سمت بڑھ رہا تھا اُسی سڑک پر نکڑ کے اندر رام داس کا اڈہ تھا۔ دونوں کی ’’طلب‘‘ جاگنے لگی کہ دو ایک گھونٹ ہی سہی۔ اُنھوں نے مڑ کر دیکھا تو جانو سیٹھ کا مسرور چہرہ نظر آیا۔ دونوں جھٹ اُن کے قریب ہو گئے۔ جانو سیٹھ نے کہا۔ ’’آواز نہیں نکل رہی ہے۔ ذرا زور سے نعرہ لگاؤ۔‘‘ گنیہ جو زرا منہ پھٹ تھا فوراً بولا۔ ’’رات بھر تو کام میں لگے رہے۔ صبح ہوتے ہی جلوس میں لگ گئے کچھ کھایا نہ پیا۔‘‘

www.taemeernews.com

جانو سیٹھ جلوس کی طوالت سے بہت خوش تھے اور اُن دونوں کے کام سے بھی مطمئن تھے۔ دونوں نے خوب محنت کی تھی۔ جانو سیٹھ نے مسکراتے ہوئے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا اور کڑکڑاتے دو ہرے نوٹ گنیہ کی طرف بڑھادیے۔ گنیہ اُس وقت نعرہ لگانے میں مصروف تھا اسلئے وہ نوٹ فکا نے جھپٹ لیئے۔

کچھ دور چلنے کے بعد دونوں جانو سیٹھ کے پیچھے ہو کر رک گئے۔ پہلے انھوں نے اپنے پلّے نکال کر قریب چلتے ہوئے بچوں کو دے دئے۔ پلّے لینے کے بعد بچوں کی نظریں اُن کے لہراتے چمکتے جھنڈوں پر لگی ہوئی تھی۔ دونوں نے اپنی رفتار اس درجہ مدھم کرلی تھی کہ جلوس دس قدم آگے بڑھتا تو وہ چار قدم۔

جب مجمع ذرا کم ہوا تو گنیہ نے کہا۔ ''جھنڈیوں کا کیا کریں؟ توبہ توبہ، اڈّے پر لے جاؤ گے ان کا پاک نام اور..... یہ مجھ سے نا ہوگا۔'' فکا نے پوچھا ''پھر.....؟''

تب تک جلوس آگے نکل چکا تھا۔ صرف چند بچے گنیہ اور فکا کے ہاتھوں میں ہرے ہرے ریشمی جھنڈوں کی تاک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اب وہ لوگ رام داس کے اڈّے سے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔

گنیہ نے اپنا جھنڈا ایک بچے کو تھما دیا۔ دوسرے بچے نے للچاتی نظروں سے فکا کے ہاتھ میں لہراتے جھنڈے کی طرف دیکھا تو اُس نے فوراً اپنا جھنڈا اُس بچے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لے تو بھی لے۔ لے۔'' بچے نے جھٹ سے فکا کے ہاتھ سے جھنڈا جھپٹ لیا۔ بچے جھنڈے لہراتے ہوئے جلوس میں شامل ہونے کیلئے دوڑ پڑے۔ جھنڈے اور پلّے دے کر وہ دونوں ایسا محسوس کررہے تھے۔ جیسے بندھوا مزدوری سے رہائی پائی ہو۔

دونوں نے دیکھا کہ جلوس کافی دور چلا گیا ہے اور اُنھیں صرف نعروں کی بازگشت اور جھنڈوں کے رنگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ جوں ہی رام داس کی گلی کا نکڑ آیا۔ دونوں سڑاپ سے اندر گھس گئے۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

اسیرِ بازگشت

وہ مسلسل دوڑ رہا تھا۔

وہ کسی جگہ بیٹھتا تو اس کے چاروں طرف چیخیں سنائی دیتیں۔ وہ کسی درخت کے نیچے بیٹھتا وہ ڈال ڈال پات پات چیختا ہوا محسوس ہوتا۔

اسے وقت کا احساس ہی نہیں تھا۔ دوڑتے ہوئے کتنا وقت پیچھے چھوٹ گیا۔ اس کے جسم پر کپڑے کانٹوں کی جھاڑیوں میں اُلجھ کر پھٹ کر لٹک گئے تھے۔ ہاتھوں پر شانوں پر پنڈلیوں پر اور رانوں پر پتھروں، کانٹوں کی خراشیں پڑ گئی تھیں۔ پیر کے ٹکوؤں اور ایڑیوں سے خون رس رہا تھا۔ وہ اپنی جسمانی اذیتوں سے بالکل بے نیاز تھا۔ ان کی طرف اس کا دھیان نہیں جاتا تھا۔ اس کا دھیان بس اس چیخ کے ارد گرد ہی رہتا تھا جو وہ مسلسل سنے جا رہا تھا۔

ایک دن وہ دھوپ کی تپش سے بچنے کیلئے پہاڑ کی ایک کھوہ میں دم لینے کیلئے بیٹھ گیا تو اسے یوں لگا پہاڑ کا ہر پتھر چیخنے لگا ہو۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دوڑنے لگا۔ اس کی زندگی جانور سے بدتر ہو چکی تھی۔ جہاں پانی ملتا پی لیتا اور جو بھی جنگلی پھل وغیرہ ملتے وہ کھا لیتا۔ اسکا بدن ایسے جھیج رہا تھا جیسے پانی کی تیز دھار سے پتھر جھیجتا ہے۔

کبھی کبھی وہ رات کے اندھیرے میں لیٹتا تو اس کا ماضی روشنی بن کر اس کے ذہن میں چمک جاتا۔

شیونتی، اس کی بہن اور پڑوس کی رضیہ اسے راکھی باندھتیں۔ اسکا خاندان اور رحیم چاچا کا خاندان دونوں ملکر ہر خوشی میں ساجھے داری کرتے۔ دکھ بھری گھڑیوں میں یہ ساجھے داری اور مضبوط ہو جاتی۔ دو بہنیں اور ایک بھائی ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے۔ شیونتی تو اس سے اکثر جھگڑا کرتی، رضیہ اس کی طرف داری کرتی۔ اسلئے وہ رضیہ کو شیونتی سے زیادہ چاہتا تھا۔ رحیم چاچا کو ایک ہی لڑکی تھی رضیہ۔ اس لئے وہ بھی اسے بہت چاہتے تھے اسکا زیادہ وقت رحیم چاچا کے یہاں ہی گذرتا تھا۔ اس کی

www.taemeernews.com

ماں کہتی تھی کہ بچپن میں وہ مہرو چاچی کی گود میں سویا کرتا تھا۔ جب شیونتی کی تصویر اس کے ذہن میں ابھرتی تو چیخیں پھر سنائی دیتیں۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوتا اور بے ست دوڑنے لگتا تا کہ چیخ پیچھے رہ جائے لیکن اسے محسوس ہوتا کہ چیخ کبھی اس کے آگے بھاگ رہی ہے اور کبھی محسوس ہوتا کہ ساتھ ساتھ بالکل ایسے دوڑ رہی ہے جیسے کھیل کھیلتے وقت شیونتی رضیہ اور وہ دوڑا کرتے تھے۔

جنگلوں، بیابانوں کو پھلانگتا وہ ایک گھنے جنگل میں داخل ہوا تو اسے ایک عمارت دکھائی دی۔ یہ عمارت سادھوؤں کا مٹھ تھی۔ مٹھ میں ایک سادھو تھے۔ بابا سروپ نند۔ جب وہ مٹھ کے سامنے کھڑا ہوا تو بابا نے دیکھا وہ ادھ ننگا تھا۔ اس کی کہنیوں، پنڈلیوں اور ایڑیوں سے خون رس رہا تھا۔ اس کا جسم بن پانی کے پیڑ کی طرح سوکھ کر ٹھنٹھ بن گیا تھا۔ اس کی قابل رحم حالت دیکھ کر بابا کی ممتا ان پر حاوی ہوگئی۔ انہوں نے اسے پاس بلایا پانی پلایا۔ پانی پیتے پیتے بھی وہ اِدھر اُدھر دہشت زدہ نظریں گھماتا تھا۔ بابا بولے۔ ''تمہیں یہاں کوئی کھترا نہیں ہے۔ کھترا وہاں ہوتا ہے۔ جہاں بہت سارے مشیہ رہتے ہیں۔ انہیں کے کھتروں سے بچنے کیلئے تو میں نے یہ جنگل بسایا ہے۔''

مہینوں بعد ہمزاد دیکھکر اس کی آنکھوں میں خوشی اُمنڈ آئی۔ بابا نے اسے بیٹھ جانے کیلئے کہا تو وہ بیٹھ گیا۔ بابا سروپ نند نے دنیا دیکھی تھی۔ دنیا کو اچھی طرح برتنے کے بعد چھل کپٹ کو جھیلنے کے بعد انہوں نے دنیا تیاگ دی تھی۔ انسانوں کے بیچ رہ کر انہوں نے اچھا تجربہ حاصل کیا تھا۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر سوچا کہ یہ لڑکا ضرور گناہ کے دلدل سے نکل کر آیا ہے لیکن اس کے ضمیر میں جو دلدل پھیلی ہوئی ہے یہ اس میں دھنستا جا رہا ہے۔

بابا نے اس کا ہاتھ پکڑا مٹھ کے پیچھے لے گئے۔ یہاں پہاڑی نالا بہتا تھا۔ بابا نے اسے نہانے کیلئے کہا۔ پھر وہ ایک دھوتی اور ایک کرتا لے آئے۔ بابا صرف آدھی دھوتی لپیٹے رہتے تھے۔ اوپری بدن کھلا رکھتے تھے۔ صرف ایک کھچا کندھے پر جھولتا رہتا تھا۔

وہ نہا رہا تھا لیکن گھبرا گھبرا کر نگاہیں پانی میں گاڑ رہا تھا۔ اوپر کہیں دور پانی کے گرنے سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اسے چیخیں محسوس ہو رہی تھی وہ پانی سے نکل نکل جاتا تھا۔ بابا نے اسے پکڑ پکڑ کر نہلایا اور کپڑے پہنائے تو وہ جانور کی جون سے نکل کر آدمی کی جون میں آ گیا۔ بابا اسے دیکھ کر مسکرائے اور سوچا۔ ''جب انسانوں کی دنیا سے چلا ہوگا تو بڑا گبرو جوان رہا ہوگا۔ اب تو پرچھائیں رہ گیا ہے۔ کچھ دن اچھا کھائے گا پیئے گا تو پھر سے گبرو جوان بن جائے گا۔''

بابا اُسے مٹھ میں لے آئے۔ جو کچھ کھانے کیلئے تھا اسے کھلایا۔ اس نے کئی مہینوں کے بعد کھانا

www.taemeernews.com

دیکھا تو اس کی بھوک لپک کر تیز ہوگئی۔ وہ کھانے پر ایسے ٹوٹ پڑا جیسے بھوکا شیر اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ بار بار اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونستا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ چیخ منھ کے اوپر آن بسی ہو اور بار بار اسے سنائی دے رہی ہو۔

کھانا کھانے کے بعد وہ لیٹ گیا لیکن چند منٹ بعد ہی اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ بابا دوڑ کر اسکے پاس پہنچے۔ اس کے قریب بیٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرا اور دلاسہ دیا۔ وہ وحشت زدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو بابا نے کہا۔

''ڈرو مت۔ یہاں تمہیں نا انسانوں سے کھترا ہے نا جناوروں سے یہاں تم آجاد ہو۔'' چند لمحے خاموش رہ کر بابا نے کہا۔ ''اتنی دور گھنے جنگل میں آنے کی وجہ کیا ہے؟ کیا راہ بھٹک گئے ہو؟''

نوجوان خاموش بیٹھا ٹکٹکی باندھے بابا کو دیکھے جا رہا تھا۔ بہت دنوں بعد اس کے ذہن نے سوچنا شروع کیا اور اس کے دماغ میں الفاظ کلبلانے لگے۔ ''ہاں راہ ہی تو بھٹک گیا ہوں۔ اگر دماغ سے چلتا تو راہ نہ بھٹکتا۔ دوسروں کے دماغ سے چلا اس لئے راہ بھٹک گیا۔''

وہ خاموش بیٹھا بابا کو تکے جا رہا تھا۔ بابا نے کہا۔ ''بولو، تمہیں کیا دُکھ پہنچا؟ اپنے من کی بات کہنے سے من کو بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' بابا سوچ رہے تھے کہیں گونگا تو نہیں ہے لیکن اس کی چیخ اس سوچ کی نفی کر رہی تھی۔ اسی لمحہ اس کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''ہاں بابا جی! ایسا ہی ہے۔ میں راہ بھٹکا نہیں، بھٹکا دیا گیا ہوں۔ اگر ان کی بات نہیں مانتا تو یہ دن نہ دیکھتا۔''

''کوئی بات نہیں میرے بچے۔ انسانوں کا تو کام ہی ہے راہ بھٹکانا، اس لئے شیطان مطمئن ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا ہے کیونکہ انسان یہ کام اس سے بہتر کرنے لگا ہے۔''

اس نے دانت کچکچائے اور کہنے لگا۔ ''صرف شیطان نہیں، یہ درندے شیطان سے بھی گئے گذرے ہیں۔''

بابا نے اپنی کمر پر لٹکی تھیلی نکالی۔ تھیلی میں سے چلم صافی اور گانجہ نکال کر گانجہ مسلنے لگے۔ گانجہ مسلتے مسلتے بولے۔

''تم کوئی چنتا نہ کرو۔ یہاں بہت آرام ہے۔ یہاں کھانے کی پھکر نہ پینے کی پھکر۔ گانجہ بھی تسکری کرنے والے چھوڑ جاتے ہیں۔''

اُنہوں نے گانجے کو چلم میں بھر کر تیلی جلائی تو تیلی کی آگ سے چلم کے منہ پر لال لال شعلہ

www.taemeernews.com

بھڑکا۔ شعلے کو دیکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے ذہن کے پردے پر لال لال خون بہہ نکلا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر بابا بھی حیران ہو گئے۔ کچھ سوچ کر وہ بولے۔

''انسانوں نے ہی انسانوں کیلئے دُکھ کے پہاڑ کھڑے کر دیئے۔ آج کے انسانوں کی دنیا نرک بن گئی ہے۔ میں بھی انسانوں کے پھیلائے ہوئے دُکھ کے دلدل سے بچنے کیلئے اور سکھ کھوجنے کیلئے سدھارتھ کی طرح پرسکون جنگل میں آن بسا ہوں لیکن میرا اگرا کل مجھے یاد آتا ہے۔ کل سے بچنے کیلئے میں گانجہ پیتا ہوں لیکن میرا کل سیلاب کی طرح دماغ میں اُمڈ آتا ہے۔ میں نے انسانوں کے بیچ رہ کر بھیانک چتر دیکھے ہیں۔ ان سے بچنے کیلئے میں بھی بھاگتا رہا۔ میں سمجھا انہیں پیچھے چھوڑ آیا ہوں لیکن وہ دُرسیہ تو میرے آگے آگے بھاگ رہے تھے یا میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔'' بابا نے قہقہہ لگایا تو وہ سہم کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

بابا نے پوچھا۔ ''تم نے چیک کیوں ماری؟ کیا کوئی بھیانک سپنا دیکھا تھا؟''

نوجوان بولا۔ ''سپنا نہیں حقیقت دیکھی، بھیانک حقیقت۔''

بابا بولے۔ ''حقیقت ہی بیان کرو۔ اگر تم اپنے بھر سے اسے نہ نکالو گے تو تمہارا جمیر تمہیں بچھو کے لگاتار ہے گا اور یہ کانون سے بڑی سجا ہوتی ہے۔''

''نوجوان نے رحم کش نگاہوں سے بابا کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''میں نے اپنے آپ کو مار ڈالا۔ میں زندہ کہاں ہوں، مجھے زندہ رہنے کا حق بھی نہیں۔ یہ حق میں نے بھیانک جرم کیساتھ کھو دیا ہے۔''

چند لمحے خلاء میں گھورنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

''میں بہت خوش تھا۔ دونوں بہنیں شیونتی جسے ہم شیوا کہتے تھے۔ رضیہ جو ہماری رجو تھی۔ دونوں ہر سال مجھے راکھی باندھتیں۔ میرا باپ رام لال اور رحیم چاچا۔ میری ماں اور مہرو چاچی۔ بس یہ پریوار تھا ہمارا.......... لیکن میں نے بہکاوے میں آ کر سب کچھ برباد کر دیا۔ مجھے گبرو دیکھ کر انہوں نے مجھے پرکھ بنا دیا۔ پھر دھیرے دھیرے میرے ذہن میں زہر گھولنے لگے۔ ذات برادری کی بات کرنے لگے۔ نفرت کی آگ بھڑکانے لگے۔ روز بیٹھک ہوتی۔ بڑے بڑے نیتا بھاشن کا راشن بانٹتے۔ ان کا ہر لفظ زہریلا ہوتا۔ انسان کی انسان سے نفرت میں نے پہلی بار دیکھی۔ انہوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا دشمن قرار دیا اور ان سے چھٹکارا پانے کے لئے ہتھیار تقسیم کئے۔ مجھ سے نیتا جی نے کہا تم وہی کرو جو کہا جا رہا ہے۔ بنگلہ، گاڑی اور نوکری تمہارا انتجار کر رہی ہے۔ رہی کانون کی بات تو کانون کو ہم نے ایک کوٹھری

www.taemeernews.com

میں بند کردیا ہے اور چابی گم کردی ہے۔ تم بے دھڑک کام کرو۔ اپنے دشمنوں کی ہر چیز لوٹ لو۔ یخت ،دھن دولت، گھر بار پھر دیکھو تم کیسے ٹھاٹ سے جیون بتاتے ہو۔" اس نے چند لمحے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کہنے لگا۔

"ہمارا جو بڑا پرکھ تھا وکرم بھائی وہ ہمیشہ مجھے ذات کا طعنہ دیتا تھا۔ کہتا تھا تو اس کے پڑوس میں رہ کر اپنا کرتو یہ بھول گیا۔ اس کا شراپ تجھے بھوگنا پڑے گا۔ میں کبھی کبھی ڈر جاتا تھا۔ ایک دن بیٹھک میں خوب زہریلی باتیں ہوئیں اور ہتھیار بھی تقسیم ہوئے۔ وکرم بھائی نے کہا کردے پڑوسی کا سروناش۔ لونڈیا بھی جوردار ہے۔ میری بہن رجو کو لونڈیا کہنے پر مجھے بہت غصہ لگا مگر میں خاموش رہا۔ وکرم بھائی نے کہا جب ہم گلی میں گھس کر لوٹ مار کریں گے، آگ لگائیں گے، ان کو کاٹیں گے تو ہتو بھی اپنا کام کرنا۔ پورے خاندان کو مار ڈالنا۔ پھر سب کچھ تمہارا ہوگا۔ وہاں خوب نعرے بازی ہوئی اور بہت سے جوان ہتھیار لہرا کر بے روک ٹوک محلوں میں بکھر گئے۔ پھر وہ تماشہ شروع ہوا جو جانوروں کی دنیا میں بھی نہیں ہوتا۔ میں بھی جوش میں بھرا رحیم چاچا کے گھر میں گھس پڑا۔ اندر سے شیوا اور رجو کی ہنسی باہر آرہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ ہنستی ہوئی دوڑ کر باہر نکلیں۔ میں سمجھا رجو ہے کیوں کہ صبح میں دیکھ چکا تھا اس نے گلابی رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ میں بھول گیا کہ شیوا اور رجو ایک ہی طرح کے کپڑے پہنتی ہیں۔ جب وہ دوڑتے ہوئے میرے قریب آئی تو اس کا منہ پیچھے کی طرف تھا۔ میں نے تلوار اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور طاقت سے اوپر اُٹھا کر گلے تک پھاڑ دیا۔ اس کی چیخ کیسا تھ ہی چہرہ میری طرف ہوا تو وہ شیوا تھی۔ میری بہن۔ اس کے بدن سے بھل بھل خون بہہ نکلا ساتھ ہی آنتیں بھی نیچے گریں۔ ایک لمحے بعد ہی وہ نیچے گری اور ٹھنڈی ہوگئی لیکن وہ چیخ میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے۔ میں پہاڑ کی کھوہ میں چھپتا ہوں تو بازگشت سنائی دیتی ہے۔ بابا اس کا کوئی علاج بتادو۔ میں کیا کروں؟"

پھر وہ رونے لگا۔ بابا نے خلاء میں گھورا اور سوچا اب شنکر جی بھی نہیں کہ انسانوں کے دماغ سے زہر نکال سکیں۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

"بیٹا تو نے گنا کبول کرلیا ہے۔ اب تجھے چھٹکارا مل جائے گا۔ آدمی اگر اپنے گنا کبول کرلیتا ہے تو اس کا من ہلکا ہوجاتا ہے۔ اب تمہارے منہ سے وہ چیک بھی سنائی نہ دے گی۔"

لیکن بابا کی آنکھوں میں بے اطمینانی چھلک آئی تھی کیونکہ وہ بھی کسی بازگشت کے اسیر تھے اور ماضی کا کفارہ ادا کررہے تھے۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

اضطراب

صبح کا وقت دھیرے دھیرے گذر رہا تھا۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اسی وقت کھٹکا ہوا۔ میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ میرے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔ بہت ہی عجیب حلیے کا آدمی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ بالکل طالبانی معلوم ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں دہشت گردوں کا حلیہ اُبھر آیا۔ سر پر چکنی ہانڈی نما ٹوپی، اس پر پٹکا اور ہاتھ میں موٹا سٹکا۔ کالی کمبل پیروں میں مٹی سے سنے ہوئے بھاری جوتے۔ میں ڈر گیا۔ کہیں کوئی دہشت گرد نہ ہو؟ دہشت گردوں کا لباس بھی بڑا دہشت ناک ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں سوالات کا طوفان مچلنے لگا۔

اس نے جوتے اُتارے، سٹکا ایک کونے میں کھڑا کیا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پٹکا اُتار کر ٹیبل پر رکھ دیا اور میری طرف اپنی میلی میلی آنکھوں سے گھورنے لگا۔ اسکی آنکھوں سے بے اطمینانی جھلک رہی تھی۔ پیشانی پر فکر کی لکریں اپنا جال پھیلائے ہوئے تھیں۔ چہرہ بڑا کربناک بن گیا تھا۔ پپڑی جمے ہونٹ اسکی کربنا کی کو بڑھاوا دے رہے تھے۔

میں طوفانی لہروں میں غوطے کھانے لگا۔

اب یہ اپنے جھبے میں ہاتھ ڈالے گا اور کوئی آتشیں ہتھیار نکالے گا یا چمچماتا خنجر۔ پھر میری طرف لہرا کر کہے گا۔ ''نکالو رقم۔'' یا پھر پناہ دینے کیلئے کہے گا۔

وقت تھم سا گیا تھا۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ گھڑی کی ٹک ٹک میرے ذہن میں بجنے لگی۔

اسکے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ مچلنے لگی۔ اسکے چہرے کی کربنا کی کو مسکراہٹ نے کم کیا۔ پھر اس نے ہونٹ ہلائے۔ ''میں بجوکا ہوں۔ پریم چند کے ہوری کا بجوکا۔''

تھوڑی دیر پہلے دہشت کی وجہ سے میرے جسم سے جان نکل گئی تھی۔ اسکے ہونٹوں کی

www.taemeernews.com

مسکراہٹ اور اسکی باتیں سن کر میرے اندر جان اور ہمت دونوں لوٹ آئے۔ میں نے کہا۔ "لیکن تم فصلوں کی رکھوالی کرنے کے بجائے اِدھر کیسے بھٹک گئے؟"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ذرا سا میری طرف جھکا، جیسے بہت ہی راز کی بات کہنے جا رہا ہو۔ پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔ "کیا کروں صاحب! ادیب لوگ مجھے چین سے جینے نہیں دیتے۔" مجھے ہنسی آ گئی۔ میرے ہنسنے پر اس نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا تو میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ میرے اندر خوف سرسرانے لگا۔ شریانوں میں خون سنسنانے لگا۔

اُس نے پھر کہا۔ "گھبرائیے مت عثمانی صاحب!"

"ایں! یہ میرا نام بھی جانتا ہے؟" ذہن میں سوال اُبھرا۔ وہ ہنسا۔ ہنسی کی آواز دروازے تک پہنچنے جیسے تھی۔ وہ پھر کہنے لگا۔ "آپ سوچ رہے ہوں گے، میں آپ کا نام کیسے جانتا ہوں؟ میں آپ جیسے سبھی لکھنے والوں کے نام جانتا ہوں۔ کئی ادیبوں نے مجھے تنگ کر رکھا ہے۔ بدنام کر دیا ہے۔" وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "دیکھئے نا عثمانی صاحب! میں ہوری کے کھیت کی رکھوالی کرتا تھا۔ پریم چند جی نے مجھے زندہ کر دیا لیکن کھیت سے باہر نہیں نکالا۔ مجھے ہوری کا ساتھی بنا دیا۔ میں ہوری کی دوستی اور اُس کے کھیت کی رکھوالی میں مگن تھا۔ اپنی جگہ کھڑا مست تھا لیکن....."

"لیکن کیا؟" میرے منہ سے کربناک سوال اُبھرا۔

وہ ہنسنے لگا۔ اِس مرتبہ اُس کی ہنسی دروازے سے باہر نکلنے جیسے تھی۔ اُس نے مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ذرا سا سیدھا ہوا اور کہنے لگا۔

"مجھے بھیئے ادیبوں نے پتہ نہیں کیا سمجھ رکھا ہے۔ جو قلم پکڑتا ہے اپنے قلم سے مجھے کچوکے لگاتا ہے۔ سریندر پرکاش کو کیا سوجھی تھی کہ مجھ سے احتجاج کرا کر کمیونسٹ بنا دیا۔ پھر کیا تھا۔ سبھی لکھنے والوں نے نرم چارا یا میٹھا گنا سمجھ کر جڑ تک چبانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سلام، پنڈت، قمر رمز، سعید، ساجد، ماجد، طاہر ماہر اور بھی کئی نتھو خیرے مجھ پر اپنے قلم سے قہر برسانے لگے۔ میں تنگ آ گیا ہوں ان قلم دھارکوں سے....." میں نے بیچ میں ٹکڑا لگایا۔ "قلم کار کہو۔" اُس نے بھنچے ہوئے ہونٹ کھولے اور ذرا غصے سے کہا۔ "نہیں میں اُنھیں قلم دھارک کہوں گا کیونکہ وہ قلم دھارک ہیں قلم کار بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے میرا قلم دھارک کہنا حق بجانب ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یار تم باقر مہدی کی طرح بحث کرتے ہو۔" اس نے پوچھا۔ "یہ

www.taemeernews.com

کون صاحب ہیں؟''

میں نے کہنا شروع کیا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ان ادیبوں نے تمہیں شہرت عطا کی لیکن شاعروں اور نقادوں نے تمہارا نام تک نہیں لیا۔ ہجوے پر بڑی بڑی نظمیں لکھیں لیکن تم پر ایک مصرعہ نہیں کہا۔ ایک وقت آیا تھا جب ہر قلم پکڑنے والا ادیب آدمی پر پل پڑا تھا۔ جسے دیکھو وہ لکھ رہا تھا، ڈھلان سے پھسلتا ہوا آدمی فریم سے نکلتا ہوا آدمی، لٹکا ہوا آدمی، اُلٹا آدمی، سیدھا آدمی۔ شاعروں نے بابا کا قافیہ تنگ کر دیا تھا۔ سبھی شاعر بابا، بابا کی تان لگانے لگے تھے۔''

اُس نے جز بز ہو کر کہا۔ ''مجھے کہاں مشہور ہونا تھا۔ یہ شہرت میرے لئے نقصان دہ ہے۔'' چند ساعت خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ ''یہ غصہ ور صاحب کون ہیں؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت قابل ہستی ہیں۔ بڑے نقاد اور بہت ہی جدید شاعر، کالی غزلیں لکھتے ہیں۔ چے گیوارا کی تصویر کے نیچے بیٹھ کر انقلاب، انقلاب کہتے کہتے چُپ ہو گئے۔ کالی غزلیں لکھ لکھ کر تھک گئے۔'' اُس نے ہاتھ کے اِشارے سے مجھے روک کر کہا۔ ''جن لوگوں نے مجھے نہیں چھیڑا اُن کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ بس! مجھے ان بمبیا قلم دھارکوں سے بچاؤ۔ اُنھوں نے ہوری کے دوست بجوکا پر قلم چلا چلا کر نیزے کی انی کی طرح چھید دیا۔ زخمی کر دیا۔ لہولہان کر دیا۔'' وہ یوں ہانپنے لگا جیسے واقعی زخمی ہو گیا ہو۔ اُس کے اندر کا کرب اسکے چہرے پر اُبھرنے لگا۔

میں نے کندھے اُچکائے اور کہا۔ ''دوست بجوکا جی! میں کیا کر سکتا ہوں؟ اس دورِ جمہوریت میں ہر ادیب آزاد ہے۔ اپنی سمجھ سے جو کرتا ہے اُسے ہی اچھا سمجھتا ہے۔ جمہوریت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔''

اُس نے پریشان ہونے کے انداز میں کہا۔ ''جو کھیت کھلیان نہیں جانتے، جو بجوکا کو نہیں پہچانتے وہ پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کیسے ان لوگوں سے پیچھا چھڑاؤں۔ کھیت کھلیان چھوڑ دوں، آنگ وادی بن جاؤں۔''

میں کہتے کہتے رہ گیا کہ تم تو آنگ وادی لگتے ہو لیکن میں نے اُس کے جذبات کی شدت کو کم کرنے کیلئے اُسے بیچ میں ہی روک کر کہا۔ ''دیکھو! تم باقر مہدی کی طرح بھڑک رہے ہو۔ تم کچھ مت بنو۔ بس اپنی جگہ ڈٹے رہو وہ خود ہی تم سے دور ہوتے جائیں گے۔ جس طرح اُنھوں نے جدیدیت کو خیر باد کیا اور مابعد جدیدیت کے پیچھے دوڑنے لگے.....'' میں کچھ اور علمیت بگھارتا لیکن اُس نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش کر دیا اور کہنے لگا۔ ''صاحب میں اتنی بڑی بڑی باتوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ پہلے ہر کاشتکار مجھے اپنے خاندان کا فرد سمجھ کر میری طرف تاکتا بھی نہیں تھا۔ سال میں ایکبار پکی

www.taemeernews.com

ہانڈی سر پر اوندھا دیتا تھا۔لکڑی کے ہاتھوں میں پھٹا پرانا قمیص اٹکا دیتا تھا۔ایک پرانے باردان کا تھیلہ لپیٹ دیتا تھا لیکن ان بمبیا لوگوں نے مجھے کھیت سے باہر گھسیٹا جب سے ہر کوئی میری طرف دیکھ کر تمسخرانہ انداز سے ہنستا ہے، جملے کستا ہے۔میرے حلیے کو دیکھ کر اب بھی پرندے ڈرتے ہیں لیکن سیانہ کوا نہیں ڈرتا۔وہ ماساہاری ہونے کے باوجود میرے کھیتوں کے چکر لگاتا ہے اور تو اور میرے سر پر بیٹھ کر بیٹ کرتا ہے۔شاید اُسے میرے بارے میں لکھنے کی بھنک لگ چکی ہے۔یہ سب انہی بمبیئے لوگوں کا کیا دھرا ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُسے کیسے مطمئن کروں۔چند لمحے سوچ کر میں نے کہا۔"ٹھیک ہے بجوکا جی! اب اس باب پر تالا لگاتے ہیں۔یعنی ہم آپ کے بارے میں کچھ نہیں لکھیں گے۔"

اُس نے ذرا گرم ہوتے ہوئے کہا۔"نہیں صاحب! آپ لکھیں اور اُنھیں چیتاؤنی دیں کہ آپ لوگ کھیت میں کھڑے بجوکا کو جگانے کی کوشش نہ کریں۔اب تو وہ کیا کہتے ہیں۔احتجاج کا زمانہ بھی نہیں رہ گیا۔احتجاج کا وقت ختم ہو گیا۔"

میں نے پوچھا۔"وہ کیسے؟"

وہ ہنسا اور بولا۔"آپ بھولے بننے کی کوشش اچھی کر لیتے ہیں۔جو احتجاج کرنے والے تھے وہ راج پاٹ میں حصہ لگائے ہوئے ہیں۔راج سنگھاسن کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ایسے....." لفظ ایسے اُس نے تمسخرانہ لہجے میں کہا تھا۔

میں نے بہت ہی سنجیدگی سے کہا۔"بجوکا جی! آپ جیسے نظر آتے ہیں ویسے نہیں ہیں۔آپ کے پاس بھی معلومات کا دریا ہے۔"

اُس نے اپنی تعریف سن کر مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور گویا ہوا۔"دیکھیے صاحب! میں بھی نام چین لکھنے والوں کے ساتھ کچھ دن رہا ہوں۔کرشن چندر، مخدوم، عباس نے جب کھیت جاگے، چمبلی کے منڈوے تلے اور زعفران کے کھیت لکھے، کھیت مالکوں کو اور کھیت مزدوروں کو جگایا۔اُنھوں نے کبھی مجھے نہیں چھیڑا۔وہ فنکار تھے۔کھیتوں سے اپنی زندگی کی شروعات کی تھی۔جلتی ریت پر تلوے لہولہان کیے تھے۔ساون کی پھواروں میں بھیگے تھے۔پہلی بارش میں کھیتوں سے اُٹھتی سوندھی مہک کو سونگھا تھا۔میں صدیوں سے دیکھ رہا ہوں۔ہندوستان ہو کہ افغانستان، فرانس کہ جرمنی، مغرب ہو کہ مشرق، زندگی کا ہر پھول کھیت ہی سے کھلتا ہے۔زمانے میں انقلاب کھیت کی پگڈنڈی سے پھوٹتا ہے۔"وہ چپ ہوا تو میں نے کہا۔

"واہ بھئی! تم تو چھپے رستم نکلے، سمندر سے بھی گہرے ہو۔"اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔"صاحب!

www.taemeernews.com

ہاریس کا دکھ درد خوشی غم، میرے اندر ہے اور پھر ان ادیبوں نے مجھے چھیڑ چھیڑ کر بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ ہوں اسلئے کچھ لکھ نہیں سکتا ورنہ لکھ کر ان کے چھکے چھڑا دیتا۔"

مجھے یاد آیا۔ کرشن، مخدوم خواجہ احمد عباس کو اُس نے قلم کار کہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ تم نے کرشن دوم اور عباس کو قلم دھارک کیوں نہیں کہا؟" اُس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "آپ بھی بال کی کھال کھینچنا جانتے یں۔ اُنھوں نے کبھی پر کبھی نہیں ماری، زندگی کو جھیلا، تب لکھا۔ کسان مٹی کی رگ رگ کو جانتا ہے۔ تب ں کا کھیت لہلہاتا ہے۔ صاحب! بس میری عرض ہے کہ آپ مجھے ان بھیڑیوں سے مکتی دلا دیں تاکہ میں ر اُدھر نا بھٹکوں۔ اپنے مالک کی فصلوں پر پہرہ دوں۔ اُن کی حفاظت کروں۔" اُسی وقت باہر ایک کوا ئیں کائیں کرنے لگا۔ کوے کی آواز سن کر وہ مضطرب نظر آنے لگا۔ میں نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں یہاں وئی نہیں آئے گا۔" اُس نے کہا۔ "یہ کوا مجھے آواز دے رہا ہے۔"

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا پٹکا سر پر جمایا۔ ہاتھ میں سنٹا تھاما، وزنی جوتے پہن کر باہر نکل گیا۔

میں گم سم اپنی جگہ بیٹھا رہا لیکن میرا ذہن اُس کے تعاقب میں چلا جا رہا تھا۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

اندھیرے سے اُلجھتی روشنی

ناسک اور اِگت پوری کے بیچ چھوٹا سا پہاڑی ٹیلہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ یہاں پتہ نہیں کس زمانے کے راجہ نے کس بات سے خوش ہوکر مندر بنا دیا تھا۔ مندر بنتا ہے تو بھگوان براجمان ہو جاتے ہیں۔ مندر کو ایک درخت نے اپنے سائے سے ڈھک لیا تھا۔ بڑا اطمینان اور سکون تھا اس جگہ، مندر کے پچھواڑے صاف ستھری کشادہ جگہ تھی۔ یہاں بہت سے آدمی آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ اس جگہ پر آنے جانے کیلئے سانپ کی طرح بل کھاتی پگڈنڈی سی کچی سڑک آگرہ ہائی وے سے مل گئی تھی۔ ٹیلے کے اوپر سے نیا نیا بنا ہوا فائیو اسٹار ہوٹل صاف نظر آتا تھا۔

یہاں سے بہت دور تک پر فضا وادی کا خوبصورت نظارہ بھی ہوتا تھا۔ یہ ہوٹل ان لوگوں کیلئے بنایا گیا تھا جو اوپر چڑھ نہیں سکتے تھے۔ اوپر چڑھنے سے انکے دلوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اے سی اور نان اے سی کمرے بنے ہوئے تھے میں نے سوچا بڑا سمجھدار مالک ہے۔ اچھا منصوبہ بنایا ہے۔ میں مندر کے سامنے بھگوان کی سنگت میں بیٹھ گیا اور ہوٹل کا نظارہ کرنے لگا۔ چند لمحے بعد کسی کار کی آواز پرسکون فضا کو آلودہ کرنے لگی۔ میری توجہ موٹر کی آواز پر تھی ایسا محسوس ہوا جیسے موٹر مندر کے پچھواڑے رک گئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد میں مندر کے پیچھے گیا تو دیکھا ایک وجیہہ اور توانا شخص قیمتی کپڑوں میں ملبوس بیٹھا ہوا تھا۔ اسکی عمر 40/45 کے بیچ رہی ہوگی۔ یہاں بالکل جنگل میں منگل کا ماحول تھا۔ ایک کرسی پر وہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے میز لگی ہوئی تھی۔ اس پر شراب اور اسکے لوازمات ترتیب سے رکھے تھے۔ اس شخص کے اِردگرد چار باڈی گارڈ مشین گن لئے مستعد تھے۔ ایک آدمی ماضی کے مہاراجہ جیسا لباس پہنے ہاتھ باندھے باادب کھڑا تھا۔ غالباً بیرا یا خانساماں تھا۔ وہ شخص کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سے وہ سب چونک پڑے۔ مشین گنیں میری طرف تن گئیں۔ میں نے اضطرابی انداز میں ہاتھ اوپر اُٹھا دئے۔ سچویشن بالکل فلمی انداز کی تھی۔ بیٹھے ہوئے آدمی نے کچھ کہا۔ دو آدمی میری طرف آئے

www.taemeernews.com

گن تانے کھڑا رہا اور دوسرے نے میری تلاشی لی۔ میرے پاس ایک کتاب پین اور چند روپے کے وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کتاب اور پین بھی تلاشی لینے والے نے اپنے قبضے میں لے لئے۔ دونوں باڈی گارڈ واپسی کے بعد وجیہہ شخص نے مجھے اشارے سے بلایا۔ میں قریب پہنچا تو میرے لئے کرسی منگائی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا چہرہ بڑا رعب دار تھا۔ اس نے میری طرف چبھتی نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں فطرت کے خوبصورت جھولے میں جھول رہا تھا۔ یہاں بھگوان اکیلے بور ہو رہے تھے اس لئے تھوڑی دیر ان کی سنگت میں بیٹھ گیا۔'' چند لمحوں پہلے اس شخص کے چہرے پر اندیشوں کی لکریں ابھر آئی تھیں جواب غائب ہو چکی تھیں۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''آدمی کا بور ہونا سنا ہے بھگوان کا نہیں۔'' اور ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''اتنی خوبصورت جگہ میں کیوں ر ہوتا۔ یہاں برسوں سے پجاری یا پجارن کے انتظار میں بیٹھے بھگوان ہی مجھے بور نظر آئے۔''

چند لمحوں بعد میں نے پوچھا۔ ''سامنے فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ غالباً وہ تمہارے ہی جیسے لوگوں کیلئے بنا ہے پورا کا پورا گراؤنڈ فلور پر اور تم شراب پینے اس ویرانے میں چلے آئے وہ بھی فوج پھاٹے کیساتھ۔'' میری باتیں سننے کے بعد اسکی آنکھوں میں گہرا کرب جھلکنے لگا۔ اس نے گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ٹیبل پر رکھ دیا۔ چند لمحوں بعد بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ''میں بڑا بدنصیب انسان ہوں۔ میں تمہاری طرح آزادی سے نہیں جی سکتا۔ گھر میں باہر، ہر جگہ موت میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اگر چند لمحے مجھے سکون کے مل جائیں تو میں بھی خود کو تمہاری طرح خوش نصیب سمجھوں گا۔''

میں سمجھتا تھا جس شخص کے پاس اعلیٰ قسم کی کار ہو، چار باڈی گارڈ ہوں، بیرے کیساتھ جنگل میں منگل منانے کیلئے سارے لوازمات ہوں وہ شخص سب سے زیادہ خوش قسمت ہے لیکن اس شخص نے میرے اس خیال کو اس اونچے ٹیلے سے گرا کر چکنا چور کر دیا تھا۔ میں نے باڈی گارڈس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''ان کے گھیرے میں تم خوف میں گھرے رہتے ہو۔ اس کا مجھے افسوس ہے لیکن میرے بھائی! موت تو برحق ہے اسے تو آنا ہی آنا ہے۔ جسے کسی شاعر نے بڑی آسان زبان میں کہا۔'' میں رکا تو وہ تیزی سے میری طرف جھکا اور کہا۔ ''جلدی بتاؤ، شاعر نے کیا کہا ہے۔'' سنو! یوں کہا ہے۔

کیا بھروسہ زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

شعر سُن کر اس کے چہرے پر سکون کی سُرخی اُمنڈ آئی۔ اس نے کہا۔ ''بھائی تم نے بڑی اچھی بات سنائی ہے میں نے زندگی میں کبھی شعر نہیں سنے۔ کبھی فلم نہیں دیکھی۔ کسی ایسے پروگرام میں نہیں گیا

www.taemeernews.com

جہاں بزنس کے علاوہ دوسری بات ہوتی ہو۔ بس دولت کمانا ہی میرا کام رہا ہے۔ میرے خاندان کو دنیا ہی جنت کا سکھ حاصل ہے لیکن مجھے دہشت اور خوف کے اندیشوں نے قید کر رکھا ہے ساری خوشیوں دور بھاگنا پڑتا ہے۔

ذرا سی آواز پر دل دھڑکنے لگتا ہے موت کے خوف سے پہلے ہی موت ہو جاتی ہے۔ میں ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟'' کیوں نا سوچوں؟'' اس نے ذرا بلند آواز میں مجھ پر سوال داغ دیا۔'' چند لمحوں تک سوچتا رہا پھر میری طرف دیکھا شاید اسے میرے خالی بیٹھنے کا خیال آیا پوچھا۔'' پیتے ہو؟'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''نہیں پینے والوں کی باتیں سنتا ہوں۔ تم پیتے رہو باتیں کرتے رہو''۔ میرے کہنے پر وہ ہنسا اور گلاس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ نہایت آہستہ آہستہ پی رہا تھا بلکہ پی نہیں رہا تھا چکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا پتہ نہیں اس ذہن کب روشن ہوگا اور اس کے ماضی کی گرہیں کب کھلیں گی۔ اس کے نشے کو مزید کم کرنے والی بات یہ تھی کہ اپنے باڈی گارڈ سے زیادہ وہ خود چوکنا تھا۔ پتہ کھڑکا کہ اسکا دل دھڑکا والی بات تھی۔ دو تین بار چکھنے کے بعد وہ کہنے لگا۔'' تم جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں بزنس مین ہوں۔ میرے پاس کتنی دولت ہے نہیں جانتا۔ کتنی گاڑیاں ہیں یہ بھی نہیں معلوم۔ مکانوں، پلاٹوں کی گنتی نہیں ہے۔ لیکن صرف ایک چیز کی کمی ہے۔ میری زندگی میں۔ خوشی کی کمی نے قلت کی حدوں کو پار کر کے قحط کی صورت اختیار کر لی ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔'' یار مزدور پچاس روپے کے عوض اپنی محنت بیچ کر تھک جاتا ہے پھر روکھی سوکھی کھا کر دن کی تمام فکروں اور اندیشوں کو تکیہ بنا کر سرہانے رکھ لیتا ہے اور کسی فٹ پاتھ پر پاؤں پسار کے سو جاتا ہے سورج کی پہلی کرن کیساتھ تر و تازہ اُٹھ کر محنت بیچنے چل پڑتا ہے۔'' میں نے سوچا یہ شخص ہزاروں لوگوں کی محنت خریدتا ہے ان کے پیٹ بھرنے کا وسیلہ بنا ہوا ہے اس کے پاس وہ آزادی، خوشی اور بے فکری نہیں ہے۔ جو اس کے مزدوروں کے پاس ہے۔ اب چسکیوں کی جگہ ہلکے ہلکے گھونٹوں نے لے لی تھی۔ اسکے سفید گالوں پر شراب کی مہین سُرخی اس طرح دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے کسی حسین عورت نے اپنے گالوں پر غازہ مل لیا ہو۔ اب تشویش اور اندیشے دور ہو چکے تھے کیونکہ اس کے بیٹھنے کے انداز میں بے فکری شامل ہو گئی تھی۔ کچھ دیر قبل کا چوکنا پن بھی اب ختم ہو گیا تھا۔ اب ہم دونوں کے بیچ مکالمہ جاری تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ کچھ دیر قبل اس کی آنکھوں میں جو ویرانی تھی اسکی جگہ ہریالی نے لے لی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔'' یار تم اس ویرانے میں بھگوان کی طرح مل گئے ہو۔ ویسے تم گہرے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ بولتے کم ہو۔'' اس نے بے تکلفی سے خالی گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا لو بناؤ

www.taemeernews.com

یہ فرانس کی ہے۔ چند ہی لوگ اسے بھارت میں پیتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ٹھنڈے ملک کی شراب پی کر میں جلد گرم ہونا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میں کبھی کبھار شوقیہ بیر پی لیتا ہوں۔ اس نے بیرے کی طرف دیکھا۔ بیرا فوراً گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور بیئر کی بوتل لے آیا۔ میں نے بوتل ہاتھ میں لی تو وہ برف جیسی ٹھنڈی لگی۔ میں نے کہا۔ ویری چلڈ وہ مسکرایا اور بولا۔ ''گاڑی میں چھوٹا سا فریج ہے۔ ٹی وی، فون اور کمپیوٹر ہر چیز ہے ایک سکون کے علاوہ۔''

تمہیں معلوم ہے پچھلے دس دنوں سے میں بے گھر ہوں۔ گھر والوں کو نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں لیکن میرے دشمنوں کو برابر معلوم رہتا ہے کہ میں کہاں ہو۔ میری گاڑیوں کے نمبر بھی ان کے پاس ہیں وہ خوش ہو کر کہنے لگا تمہیں معلوم ہے۔ اس مرتبہ میں انھیں جل دے دیا ہے۔ دوسروں کی گاڑیاں استعمال کر رہا ہوں اور وہ لوگ ائیر پورٹ گھر اور دفتروں کی نگرانی کر رہے ہونگے حرامزادے۔ اسکی نفرت لفظ حرامزادے کی شکل میں نکل آئی تھی۔ میں نے ایک بڑا گھونٹ لے کر کہا ''اب تم مجھے پسند آئے ہو وہ کیسے؟'' اس نے بڑے انہماک سے پوچھا وہ ایسے کہ پہلے تو تم نے ان کو حرامزادے کے خطاب سے نوازا اور ان حرامزادوں کو جل دے دیا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے انھیں جل دیئے جاؤ اور جیئے جاؤ وہ ہنسنے لگا۔ اب اس کی ہنسی میں جان محسوس ہوتی تھی چند لمحوں بعد اس نے بھی لمبا گھونٹ بھرا اور کہا تمہیں دنیا کی کوئی فکر نہیں۔ میں سوچتا ہوں میں بھی تمہاری طرح بن جاؤں۔ بے فکر آزاد زمانے کی بندشوں سے دور۔ کیا یہ ممکن ہے؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ممکن کیوں نہیں؟'' میں نے مختصر جواب دیا۔ مصالحت میرے دوست مصالحت دنیا میں جینا ہے تو مصالحت سب سے اچھی عادت ہے۔ اس نے گلاس اُٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میری بات سن کر ہاتھ کھینچ لیا۔ دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں اور میری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کس کس سے مصالحت کروں؟ موت کے فرشتوں سے؟ اپنے گھر والوں سے؟ ہزاروں کارکنوں سے میرے لئے مصالحت بجلی کا بلب ہے۔ ایک روشن کرو تو دوسرا بجھتا ہے۔ رہی حکومت تو وہ بھی ہمارے جیسے لوگوں کو تیڑھی نگاہ سے دیکھتی ہے جب دو ایک زندگی موت کی آغوش میں سلا دی جاتے ہیں۔ جب ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے تو پولس اس خوشی میں سائرن بجاتی بڑے طمطراق سے آتی ہے اور قصہ ختم وہ قہقہہ مار کر ہنسا اب اس کے اندر کھلنڈرا پن عود کر آیا تھا۔ میری طرف دیکھ کر کہا تم کچھ بولتے نہیں ہو۔ ایسا نہیں کہ تم میری باتیں جان لینے کے بعد تم بھی میرے حریف بن جاؤ گے۔ وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ میں نے ایک گھونٹ لیا اور اسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ حریفائی میرا شیوہ نہیں ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق تمہارے حریف اور رقیبوں کی خاصی بڑی تعداد ہے وہ آپس میں مار کاٹ

www.taemeernews.com

بھی کرتے ہونگے اور میں کتنا نہیں چاہتا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ پاپی پیٹ ادھر اُدھر جھانکنے نہیں دیتا۔ گھر کی ذمہ داریوں نے مجھے کولھو کا بیل بنادیا ہے۔ کبھی کبھار فرصت کے لمحات مل جاتے ہیں تو فطرت کی گود میں جا بیٹھتا ہوں لیکن تم جیسے لوگ بھی یہاں آنے لگے تو یہ جگہ بھی مخدوش ہو جائیگی۔"

ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ پھر اس نے کہا۔"یار تم سچ کہتے ہو۔ بتاؤ میں کیا کروں؟ ایک دشمن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں تو دوسرا ٹانگ کھینچنے کیلئے تیار کھڑا رہتا ہے۔ ایک گھونسہ تو دوسرا لات مارتا ہے۔ میری زندگی نہ ہوئی فٹ بال ہوگئی۔"

"میرا ایک ہی مشورہ ہے۔" میں نے بڑے فلسفیانہ انداز سے کہا۔"زندگی اور موت دونوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ موت کے پیچھے تم خود بھاگو۔ موت تم سے ڈر کر بھاگے گی اور یہ سب کرنے کیلئے تمہیں معمولی آدمی بننا پڑے گا۔ کسی گمنام محلے میں کرایے کا مکان لے کر تم رہو گے۔ معمولی کپڑے پہن کر سائیکل پر چلو گے تو تمہیں کوئی نہیں پہچانے گا کہ تم ہی وہ سیٹھ ہو جس کی تجوریوں میں روپے یوں ٹھسے ہوئے ہیں جیسے شہد کے چھتے میں شہد ہوتا ہے۔" اب اندھیرا ہونے لگا تھا۔ بیرے نے گیس پیٹرومیکس جلادی تھی۔ میں نے کہا۔"بھئی فطرت کو کیوں مجروح کرتے ہو۔ پیٹرومیکسن بجھادو۔ ستاروں کی ہلکی روشنی میں بیٹھ کر شراب نوشی کرو تو بڑا مزہ آئے گا۔ تم ساری کلفتیں دکھ درد بھول جاؤ گے۔ چند لمحوں کیلئے ہی سہی اپنے ماحول سے باہر تو نکلو۔" اس نے اشارہ کیا گیس بتی بجھادی گئی گلاسوں پر اور شراب کی بوتلوں پر ستاروں کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے روشن ستاروں کو ہم نے پکڑ رکھا ہے۔

کافی وقت بیت گیا تھا۔ ہم دونوں کی بوتلیں خالی ہو چکی تھی۔ میں نے کہا۔"اب تم بالکل میری طرح مزے لوٹ رہے ہو۔ یہی سچ ہے باقی سب جھوٹ۔ ایک ایک لمحے کا استعمال ایسے کرو جیسے خدا یا بھگوان نے تمہیں عطا کئے ہیں۔ رونا بسورنا بزدلی کی نشانی ہے۔ جس کا میں بے حد مخالف ہوں۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا اور کہا۔"ایسا لگتا ہے کچھ دیر اور میرے ساتھ رہو گے تو مجھے کسی مشہور آدمی کی طرح بہادر بنادو گے۔ اتنا بھی نہیں تم بمبئی پہنچتے ہی وانکھیڈے اسٹیڈیم پہنچ جاؤ اور کسی مشہور پہلوان کو چیلنج دیدو۔ میں نے قہقہہ لگایا وہ بھی دل کھول کر ہنسنے لگا۔

جب ہم دونوں کی ہنسی تھمی تو اس نے بیرے کو اشارہ کیا۔ بیرے نے ہم دونوں کیلئے بوتلیں لا کر کھول دیں۔ جب بیرا بوتل کھول کر رکھنے جھکا تو میں نے دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سرے پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ اس نے اپنے صافے کے دامن سے آنکھیں پونچھیں اور اپنی جگہ ایئر انڈیا کے مہاراجہ کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بیئر گلاس میں انڈیلی اور لمبا سا گھونٹ بھر کر بیرے کی طرف دیکھا

www.taemeernews.com

تو اس کی آنکھوں کے آس پاس تارے جھلملا رہے تھے۔ میں نے اشارے سے اسے قریب بلایا تو قریب آکر وہ بڑے ادب سے جھک کر بولا۔ ''فرمایئے صاحب!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ایئر انڈیا کے مہاراجہ کی طرح جھک کر بات کرتے ہو تو اچھے نہیں لگتے ہو۔'' بیرا سمجھا کہ مجھے نشہ ہو گیا ہے وہ میری طرف سے تشویش میں مبتلا نظر آیا۔ وہ میری طرف ایسی ہی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بھائی! اس ویرانے میں موتی کیوں لٹا رہے ہو؟'' اس نے غمزدہ آواز میں کہا۔ ''بابو جی! کئی برس بیتے ہمارے مالک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں آئی لیکن آج وہ قہقہہ مار کر ہنسے تو میری آنکھوں سے خوشی چھلک پڑی۔'' ''وفاداری کا یہی شیوہ ہے۔'' میں نے بیرے کو شاباشی دی۔ ''اب تمہارا مالک ہمیشہ مسکرایا کرے گا۔ میں نے اسے جینے کا گر سکھا دیا ہے۔'' بیرے نے کہا۔ ''بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔ میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دونگا۔'' وہ پھر اپنی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا۔

رات کا سفر کافی ہو چکا تھا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ وادی کا پورا منظر بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی ایسے منظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ میں منظر میں اور کھو جاتا۔ اچانک یاد آیا کہ مجھے تو صبح ڈیوٹی پر جانا ہے اسلئے میں نے کہا۔ ''اب مجھے چلنا چاہیئے۔ مجھے نیچے سے بس مل جائے گی۔'' میں کھڑا ہوا تو وہ بھی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ ''میں بھی چلوں گا تمہارے گھر۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''نہیں بھائی! یہ تمہارا تام جھام دیکھ کر ہمارے چھوٹے سے محلے میں زلزلہ آجائے گا۔''

اس نے گاڑی میں سے اپنے کپڑے منگوائے اور اس کے ڈیل ڈول کے گارڈ سے تبدیل کر لئے۔ ہم دونوں ہائے وے پہنچے۔ میں نے آٹو رکشہ روکا اور یہ طئے کیا کہ دوارکا ہوٹل میں قیام کریں گے۔ جوں ہی ہم دوارکا ہوٹل کے کمرے میں پہنچے وہ کپڑے تبدیل کئے بغیر ہی بستر پر گرا اور یوں سو گیا جیسے چھوٹا بچہ ماں کی گود میں سو جاتا ہے۔ ساری فکروں سے دور میں مسکرایا اور سوچا کہ آج اس شخص نے اپنی ساری الجھنوں، فکروں اور اندیشیوں کو تکیہ بنا لیا ہے۔

میں صبح جاگا تو میرے سرہانے نوٹوں کی دو گڈیاں اور اُس کا فوٹو اور کارڈ ملا۔ اس کا بستر خالی تھا اور اُسکا چھوٹا بریف کیس بھی نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جا چکا ہے۔ میں نے چائے منگوائی تو بیرے نے ٹرے بھر کر ناشتے کا سامان لا کر رکھ دیا اور کہا۔ ''صبح جاتے وقت صاحب نے آپ کا تین دن کا کرایہ اور کھانے پینے کی رقم جمع کر دی ہے اور کہہ گئے ہیں کہ آپ کا خاص خیال رکھا جائے۔''

گردش زمانہ کیساتھ اس کا چہرہ میری یادوں کے نہاں خانے میں پوشیدہ ہو گیا۔ ایک دن اخبار میں میں نے اُس کی تصویر دیکھی تو یاد آگیا کہ اُسے کہیں دیکھا ہے۔ پھر ماضی کی یادیں اخبار کے

www.taemeernews.com

پورے صفحے پر پھیل گئیں۔ تصویر میں وہ زخمی حالات میں پڑا ہوا تھا۔ قریب ہی اُس کی کار کھڑی تھی۔ جس کے شیشے اور دروازے گولیوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ خبر میں بس اتنی تفصیل تھی کہ مشہور صنعت کار جی۔ کے۔ سنجا جی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ انھیں زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ قاتل فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

میں رات بھر سو نہیں سکا۔ بار بار اُس کا اُداس، ہنستا ہوا قہقہہ لگاتا ہوا چہرہ میرے سامنے آجاتا۔ میں نے پرانی ٹرنک میں سے اُس کی تصویر نکالی اُس کا کارڈ بھی ملا اُس کا فوٹو نکالتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں سے یادیں بہہ نکلی ہوں۔ میرے سامنے ٹیلے کے سارے منظر ایک ایک کر کے گذرتے رہے اور میں دیر تک چٹکی چاندنی میں اُس کی ڈھارس بندھاتا رہا۔

دوسرے دن میں نے اخبار میں دیکھا تو پھر دھچکا سا لگا۔ اس میں لکھا ہوا تھا مشہور صنعت کار سنجا جی کو کل زخمی حالت میں اسپتال میں داخل کیا گیا تھا لیکن وہ بچ نہیں سکے۔ ان کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگ سکا۔

میرے منہ سے قاتلوں کیلئے نفرت آمیز الفاظ نکلے۔ ''بالآخر مار دیا۔ حرامزادوں نے ایک اچھے آدمی کو۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

مسیحا

شہر میں خوشیاں رقصِ کناں تھیں۔

شہریوں کے چہروں پر گلال رنگ کھلا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کا بسیرا تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں مگن تھا۔ ایک دوسرے سے لین دین میں ایمان داری اور دین دھرم میں رواداری برتی جاتی تھی۔

شاید زمین پر پھیلی خوشی اور شانتی آسمان کو بھی نہیں بھاتی یا زمین پر بسے ہوئے کچھ لوگوں کو امن کے کبوتروں کو زخمی کرنے کی عادت ہے اس لئے دشمنِ امن موقع کی تاک میں رہتے ہیں اور اپنی غلاظت انسانوں کے بیچ پھیلا کر بدامنی پھیلا دیتے ہیں۔

اُس دن بھی یہی ہوا۔ شہر کی ساری خوشیاں آنسو گیس کے گولوں کے دھوئیں میں اور بندوق کی گولیوں سے ہوا میں تحلیل ہوگئیں۔ امن و شانتی کے کبوتر زخمی ہو کر پھڑ پھڑاتے دھرتی پر گرے اور لہو لہان ہوگئے۔ ہنستے کھیلتے بچے رونے بلکنے لگے۔ لوگوں کے چہروں سے غازے کی سُرخی غائب ہوگئی۔ پیشانی پر سوچ کی لکیریں اور چہروں پر غم و یاس کی کھرنڈ جم گئی۔ عورتوں نے خدا کو یاد کیا اور المدد المدد کی آوازیں آسمان کی طرف پرواز کرنے لگیں لیکن ان آوازوں کیساتھ ہی گولیوں کے صور بھی فضا میں تحلیل ہونے لگے۔ آگ، دھواں خون کی چراند ہر طرف پھیلنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جو انسان انسانوں کو مار کاٹ رہا تھا وہ انسان ہے کہ درندہ۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر میں ہر طرف بدصورتی نے اپنا ڈیرا جمالیا۔ جو بازار شہر کی رونق تھے وہ زلزلہ زدہ مٹی کا ڈھیر نظر آنے لگے۔ کہیں کہیں دکانیں ایسی نظر آتی تھیں جیسے کالے بھوت کھڑے ہوں اور اُن کے منہ سے آگ کی زبان لپ لپ کرتی باہر نکلتی اور اندر جاتی ہے اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دھواں اُگلتے ہوں۔ معصوم، بے قصور امن پسند شہر کی تعمیر و ترقی میں جُٹے ہوئے لوگوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جنگلی درندوں میں گھر گئے ہوں اور یہ درندے جلد ہی انھیں پھاڑ کھائیں گے۔ شہر میں قیامت کا ڈیرا تھا۔ ہر طرف بربادی ہی بربادی تھی۔ ایسے وقت معصوم انسان صرف اپنے خدا سے دعا مانگتا ہے۔ شاید ان معصوموں کی دعا قبول ہوگئی تھی۔

www.taemeernews.com

آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہو تو کون اپنی جان جوکھم میں ڈالنا پسند کرتا ہے لیکن سیٹھ اکرام کا جذبۂ ملت افواہیں سُن کر جوش مارنے لگا۔ انھیں غیرتِ ملت نے للکارا۔ انھوں نے اپنے چند ساتھیوں کو ساتھ لیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر نکل پڑے۔ قریبی پولس اسٹیشن جا کر حالات کا جائزہ لیا اور پولس کی مدد سے دردمندوں کے بیچ گھرے معصوم انسانوں کو نکالنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ ایسے نفسا نفسی کے عالم میں ایک ہمدرد کو پا کر غموں کے پہاڑ تلے دبے انسانوں کے چہروں پر سے اُداسی کی پرتیں ہٹیں۔

سیٹھ اکرام کی انسان دوستی اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر لوگوں کو خطرے سے باہر نکالنے کے کارناموں نے افواہوں کی جگہ لے لی۔ اخبار والوں نے اُن کی تعریفوں کے ایسے پل باندھے کہ سیٹھ اکرام اپنی تمام دولت بھی صرف کرتے تو ایک پل بھی باندھ نہیں پاتے۔ اخبارات میں اپنی تصویریں اور تعریفی جملے دیکھ کر سیٹھ اکرام کی پہلے سے تنی گردن کے تناؤ میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اُن کے اردگرد کے لوگ اخبارات لا لا کر انھیں پڑھ کر سُناتے تو سیٹھ اکرام کے ہونٹوں پر فاتح مُسکراہٹ قبضہ جما لیتی۔ اُن کے ایک مشیر نے انھیں اخباری بیان جاری کرنے کی ترغیب دی تو سیٹھ اکرام کے ہونٹوں پر کھیلتی مُسکراہٹ نے ہنسی کی جگہ لے لی۔ مشیر نے جھٹ بیان تحریر کیا اور اخبار والوں کو بلا لیا۔ اُن کا بیان تھا کہ انھوں نے یہ کام انسانی ہمدردی اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا ہے۔ اُن کا بیان پڑھ کر لوگ خوش ہوئے۔ ہر زبان پر ان کی بے غرضی کے قصے تھے۔ شہر سے منحوسیت، اُداسی، غم اور تباہی و بربادی دھیرے دھیرے ہٹنے لگی۔ لوگ پہلے سہمے سہمے اپنے کاروبار کی جانب رُجوع ہوئے۔ ایک دوسرے کے چہروں کی طرف شک بھری نگاہیں پڑنے لگیں لیکن زندگی ہر حال میں رواں دواں ہو جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے شہر کی فضا بھی مندمل ہونے لگی۔ جیسے گہرا زخم صحت پاتا ہے۔ گاہے گاہے سیٹھ اکرام کا نام آتا تھا۔ سیٹھ اکرام کو خدشہ تھا کہ کہیں لوگ انھیں بھول نہ جائیں۔ اُن کا تعلق جس قوم سے تھا وہ قوم بڑی بھلکو اور اپنے پرکھوں، ہمدردوں سے بہت جلد ناطہ توڑ لینے والی تھی۔ اُن کی قوم کا ناطہ پیٹ سے جُڑتے ہی سب کچھ بھول جانے کی عادی تھی۔ اس لیے سیٹھ اکرام سوچنے لگے کہ لوگوں کے بیچ اپنے آپ کو کیسے زندہ رکھا جائے؟ انھیں دنوں مرضی سرکار یہ ہوئی کہ شہر میں الیکشن کرایا جائے۔ پھر ایک خاص جماعتی ٹولہ جمع ہوا اور مشوروں پر مشورے لئے جانے لگے۔ بالآخر سیاسی بدمستوں نے سیٹھ کو گھیر گھار کر شیشے میں اُتار لیا اور انھیں الیکشن کی سُولی پر چڑھا دیا۔ اُن کے چرچے قیامتِ صُغرا کے دنوں کی طرح پھر گونجنے لگے۔

ظاہر ہے جتنی ہوا انتخاب میں خرچ کا نصاب بے حساب ہوتا ہے۔ کسی قریبی یا بعید زمانے میں آپ نے عوام کو چاندی کا نوالہ کھلایا ہو، اُن کے اچھے بُرے کاموں میں شریک رہے ہوں لیکن انتخابی دور میں

www.taemeernews.com

سونے کا نوالہ کھلانا ہی پڑتا ہے۔ جب سیٹھ اکرام جیسا آدمی انتخاب کے میدان میں اُترتا ہے تو تجوریوں کے منہ خود بہ خود کھلنے لگتے ہیں۔ سیٹھ اکرام کی تجوریوں نے بھی سیم وزر اُگلنا شروع کر دیا۔ اُن کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک مقرر اور شعبدہ باز جمع ہو گئے۔ تقریر میں کوئی انھیں کوئی فخر ملت کے خطاب سے نوازتا تو کوئی اُن کے سینے پر مسیحائے وقت کا تمغہ آویزاں کر دیتا۔ شہر کا وہ خطہ جہاں سے سیٹھ اکرام انتخاب میں مشغول تھے میلے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

سیٹھ اکرام اپنے مرکزی دفتر میں بیٹھے کبھی ہنستے کبھی مُسکراتے تھے۔ شاید مستقبل کے سُنہرے دور میں پہنچ جاتے ہوں۔ ایک دن وہ ایسے ہی سُنہرے دور کے مزے لے رہے تھے کہ بڑی دلگداز آواز نے انھیں پرفضاء خطے سے نکال کر ہنگامے کی دنیا میں بلا لیا۔ انھوں نے آواز کی طرف گردن پھیری تو سامنے ایک ہاتھ پھیلائے، دوسرے ہاتھ سے کندھے پر بچہ تھامے ایک عورت کھڑی تھی۔ انھوں نے اپنے ایک کارکن کو آواز دی اور کہا۔ ''رمجو! دیکھ تو یہ عورت اپنی ووٹر ہے کیا؟''

رمجو نے پہلے للچائی ہوئی نظروں سے عورت کا جائزہ لیا۔ پھر عورت سے پوچھا۔ ''اے! تو کہاں رہتی ہے؟'' عورت نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ''نوی بستی میں۔'' رمجو کے منہ سے نکلا ۔''دھت تیرے کی۔'' پھر سیٹھ کی طرف مڑھ کر بولا۔ ''نہیں۔'' عورت نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ''سیٹھ میرا بچہ بیمار ہے اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔'' رمجو نے ڈانٹ کر کہا۔ ''جا بائی جا۔ ہمیں یہاں ووٹوں کی فکر لگی ہے اور تجھے دوادارو کی پڑی ہے۔'' عورت کی نگاہیں سیٹھ پر مرکوز تھیں۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے سیٹھ اکرام حال سے نکل کر پھر مستقبل کی خوشگوار فضاؤں میں ڈول رہے ہوں۔

عورت نے اپنے بیمار بچے کو تھامہ اور بولی۔ ''جس آدمی نے تجھے فرشتہ کہا تھا اور مجھے تیرے دروازے پر بھیجا تھا شاید وہ شیطان تھا۔'' اُس نے سیٹھ اکرام اور رمجو پر قہر آلود نگاہیں ڈالیں اور اُن کے حلقے کی ایک گلی میں گم ہو گئی۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

قفس

اُس نے نظر بھر کر اپنی اوڑھنی کے جھولے میں جھولتے ہوئے گوشت کے لوتھڑے کو دیکھا اور آنکھیں موندے پڑا تھا۔ اُس کے گلاب کی پنکھڑی سے ہونٹوں پر کبھی بادِ نسیم کی طرح چلنے والی ہوا کی طرح باریک سی مسکراہٹ کھلنے لگتی۔ کبھی وہ ہمک ہمک کر ہنستا تو مدھم سا ترنم محدود دائرے میں پھیل جاتا وہ ہاتھ بڑھاتی پھر روک لیتی۔

جنم اشٹمی کے دن گوشت کا یہ لوتھڑا اُس کے پیٹ سے جدا ہوا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی کوکھ کی مٹی میں کس نے یہ بیج بویا۔ وہ ایسی کھیتی تھی جس پر نہ جانے کون کون ہل چلاتا تھا۔ نہ جانے کون کون اُس کے بدن کی کھیتی کو گوڑتا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ دن ہو یا رات جس طرح بٹن دباتے ہی روشنی ہو جاتی ہے اسی طرح اُسکے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا۔ جیسے ہی وہ دروازہ کھولتی ایک ہیولا سا اندر آتا۔ کبھی ہوش حواس میں، کبھی مدہوشی میں۔ پھر وہ اپنی ادا کی ہوئی قیمت وصولتا اور چلا جاتا۔ وہ تھک جاتی کبھی تھکاوٹ کی منتظر ہوتے ہوئے سونے کی کوشش کرتی۔ کبھی آنکھ لگ جاتی کبھی سامنے ٹنگی ہوئی تصویر پر ٹک جاتی۔ کبھی وہ سوتے میں خواب دیکھتی کبھی جاگتے میں۔

اکثر وہ ایک خواب دیکھتی۔ ایک روشن گیند اُس کے سامنے آجاتی۔ وہ اُس گیند کو پکڑنے کیلئے ہاتھ بڑھاتی۔ روشن گیند اُس کے ہاتھوں کی دسترس سے باہر ہو جاتی۔ وہ دو قدم آگے بڑھاتی۔ روشن گیند پھر آگے بڑھ جاتی۔ یہ کھیل بہت دیر تک جاری رہتا۔ آخر وہ تھک کر بیٹھ جاتی۔ اُس وقت اُس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ سامنے دیکھتی تو سامنے وہی تصویر۔ وہ سوچتی ہے یہ تصویر کالے بچے کی ہے۔ وہ روشن گیند کا خواب دیکھ رہی ہے۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔۔ وہ اپنے خواب کی روشن گیند کو اپنے ذہن میں روشن ہوتے ہوئے دیکھ کر مسکراتی اور سوچتی، کبھی دنیا میں ایسا بھی ہوا؟ اُس وقت اُس کے دروازے پر ہلکی کھٹ کھٹاہٹ ہوتی۔ دروازہ کھولتی۔ پھر وہی ہیولا۔ کبھی بے جان کبھی جان دار کبھی خوف زدہ کبھی وحشت زدہ۔ کبھی پھیکی مسکراہٹ والا کبھی مصنوعی ہنسی والا۔ گھنٹہ آدھا گھنٹہ بے جانی، بدمزگی، بے کیفی میں گذر

www.taemeernews.com

جاتا۔ ہیولا باہر نکل جاتا وہ نیند کی آغوش میں پہنچ جاتی۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ آتے جاتے رہے۔ اُس نے کبھی اپنی زندگی کے بارے میں نہیں سوچا۔ سوچتی بھی کیا؟

لیکن اب اُسے سوچنے کی ضرورت آن پڑی۔

اُس نے اپنی ساتھی سے کہا۔ ''میں مصیبت میں پڑ گئی ہوں۔''

''کیسی مصیبت؟'' ساتھی چونک کر پوچھ بیٹھی۔

''دو مہینے ہو گئے میں نہائی نہیں۔'' اُس کی ساتھی ہنس کر بولی۔ ''حرامزادی مذاق کرتی ہے۔ روز تو نہاتی ہے۔''

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اری بھولی مت بن۔ میرا مطلب روز کے نہانے سے نہیں ہے۔''

اب اُس کی ساتھی سنجیدہ ہو گئی اور اُس نے رانو کی ساڑی کے نیچے سے بلاوز ہٹا کر اُس کے پیٹ کی طرف دیکھا۔ گہری نظروں سے پیٹ کا جائزہ لے کر بولی۔ ''اس میں کچھ کچھ بڑھ رہا ہے۔ دوا کیوں نہیں لے لیتی۔ تیرا یہ کمرہ خالی ہو جائے گا اور تو کنواری ماں بننے سے رہ جائے گی۔ اپنے یہاں پاپی پیٹ کیلئے کسی کے پاپ کو اپنے پیٹ میں پالنا سب سے بڑا پاپ ہے۔ تجھے معلوم ہے۔ کالی بھمبھو کو معلوم ہو گا تو کان پکڑ کر دواخانہ لے جائے گی اور پاپ کو دھلا دے گی۔''

اس بلڈنگ کی نائکہ کو وہ سب کالی بھمبھو کے نام سے یاد کرتی رہتی تھیں۔ وہ تھی بھی ایسی ہی پہاڑی عورت، کوئلہ رنگ بدن۔

اُس نے اپنے پیٹ کی طرف دیکھا پھر ہاتھ پھیرنے لگی۔

کچھ لمحوں بعد جس طرح ہوا سرسراتی ہے۔ اس طرح سرگوشیاں سرسرانے لگیں اور کالی بھمبھو کے کان سنسنانے لگے۔ کچھ دیر بعد ہی اُس کی حاضری ہوئی۔ کالی بھمبھو کے چہرے پر غصے کی کالی لہریں لرزنے لگیں۔ ہونٹ پھڑپھڑانے لگے اور آنکھیں آگ اُگلنے لگیں۔ ''تیری یہ مجال۔ میرے سے چھپانے چلی۔ چھنال کی چھنالی چھپ جاتی مگر اُس کے پیٹ میں پڑا بیج نہیں چھپتا۔ نکال لے جلدی اپنے جسم کا کمرا کھالی کر لے مادلی، نئی تو تیرے بارہ بجا دے گی یہ سیتامیا۔'' اُس نے پھنکارتے ہوئے اپنے سامنے لرزتی کھڑی رانو کی طرف آگ بھری نظروں سے دیکھا اور اُس کی چوٹی پکڑ کر بولی۔ ''ابیج جا اسپتال میں اور دھوڈال اس پاپ کو۔''

پہلی بار اُس نے سوچا اور من ہی من بولی۔ حرامزادی روز روز تو پاپ کرنے لگاتی ہے۔

www.taemeernews.com

ہمارے پاپ پریکش کرتی ہے۔ دارو پیتی ہے۔ جوا کھیلتی ہے۔ سگریٹ دھڑکتی ہے۔ موٹی کالی بھینس کتنوں کو اپنی پاپ کی گنگا میں ڈبو دی۔ اب مجھے پاپ کی جمنا سے نکالنا چاہتی ہے۔ اُس نے ارادہ کرلیا کہ وہ اپنے جسم کے اس حصے کو نہیں دھوئے گی۔ اُس کے اندر پتا نہیں کہاں سے سنسناہٹ پیدا ہوئی اور ناختم ہونے والی طاقت بھر گئی۔ وہ بولی۔ ''دیکھ مائی! تیری ہر بات مانی مگر یہ بات نہیں مانوں گی۔''

سیتا نے اپنا سونے کا کڑا پہنا ہوا ہاتھ لہرایا اور پھنکاری۔ ''رانڈ، بھڑوی، چھنال، اس پاپ کا باپ کون بھڑوا ہے تجھے معلوم ہے؟ جب پاپ پکنے لگے گا نا تو تجھے کوئی کوڑی میں بھی نہیں پوچھے گا۔ پھر کیا پھاکے گی۔ پھاکہ! میرے دروجے بھی ایسو کے واسطے بند ہو جاتے۔ معلوم تجھے۔ یہ کوئی دھرم آسرم سالا نہیں۔ سالا یہ تو آؤ جاؤ اور کماؤ گھر ہے۔ اگر تیری جیسی کھبسورت عورت بچے جننے لگے تو کیا اُس کی کھبسورتی باقی رہے گی؟'' اُس نے رانو کو سمجھاتے ہوئے ذرا نرم لہجے میں کہا۔ پھر اُس کے پیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ابی کچھ بگڑا نہیں۔ کچھ دن اوپر ہوئے تو پھر بگڑ جائے گا۔ ابی ٹیم ہے۔ سدھار لے اپنے کو، نہیں تو تیری مٹی کھراب ہونے میں دیر نہیں لگے گی سمجھی۔'' اتنا کہہ کر وہ آواز دینے لگی۔ ''اری مٹو۔ مٹو۔ ادھر آ۔ اس پیٹ پھولی کو اسپتال لے جا۔ اپنی نرس کو بتا۔ اس کا کمرا کھالی کرا کے لے آ، سمجھی۔'' ہدایت دینے کے بعد اُس نے وہسکی سے بھرا گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگی۔

جب وہ اور مٹو دواخانہ پہنچے تو مٹو اپنی ضرورت سے باتھ روم میں چلی گئی تو وہ وہاں سے سٹک گئی۔ وہ اپنے ایک رشتے دار کے یہاں پہنچ گئی۔ زندگی تو زندگی ہوتی ہے۔ دنیا کا دستور ہے کہ چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ کوکھ میں جسم پلتے ہیں۔ جانے انجانے انکور پھوٹتے ہیں۔ کونپلیں بڑھتی ہیں۔ زندگی جنم لیتی ہے۔ چاہے نرم گدوں پر، چاہے سخت سنگلاخ دھرتی پر۔ سنگلاخ سے سنگلاخ دھرتی پر بھی کسی نہ کسی دراڑ میں لالہ کھل ہی جاتا ہے۔

اُس نے اپنی اوڑھنی کے دونوں سروں کو پلنگ میں باندھ کر جھولا بنایا دیا تھا۔ اُس میں یہ لالہ پڑا ہوا تھا۔ وہ سوچتی۔ اس کا باپ بھی میں ہوں اور ماں بھی میں ہوں۔ وہ مسکرا دیتی۔ ایسی مسکراہٹ جو پالنے کے بجائے جھولے میں لیٹے ہوئے بچے کے ہونٹوں پر کھلتی ہے۔

زندگی کسی کے روکے نہیں رکتی۔ وہ بڑھتی گذرتی چلی جاتی ہے۔ پالنے کی بجائے کپڑے کے جھولے میں یہ جھولتا ہوا کرشنا بڑھتا گیا۔ رانو کی زندگی گھٹتی گئی۔ اُسے دکھ کھائے جا رہا تھا کہ کسی دن اگر کرشنا نے پوچھ لیا کہ ماں! میرا باپ کہاں ہے تو وہ کیا جواب دے گی۔ وہ اپنے ذہن میں کئی باپوں کی

www.taemeernews.com

تصویریں جمع کرتی پھر اُنھیں تحلیل کر دیتی۔ کئی ناموں کو یاد کرتی پھر اُنھیں بھول جاتی۔ ویسے اُس نے سکول میں کرشنا کے باپ کا نام سوہتی یعنی ساتھ رہنے والا لکھوایا تھا۔ پتہ نہیں یہ لفظ اُس کی زبان پر کیسے آ گیا تھا۔ کرشنا دن رات پھلانگتا ہوا بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اُس کے اندر ذہانت کا خزانہ بھرا ہوا تھا۔ چند سالوں بعد ہی اُس نے ماں سے اپنا بوجھ ہٹا لیا بلکہ ماں کی خشک بے جان آنکھوں میں زندگی کی چمک بھی بھر دی۔ اُسے کئی اداروں سے اسکالرشپ ملنے لگی۔ وہ پڑھنے بھی لگا اور اپنا اور ماں کا پیٹ بھرنے کا سہارا بھی بننے لگا۔

ایک دن۔ وہ دن، جو زندگی میں روشن گیند کو ہاتھوں میں تھما دیتا ہے اُس کی زندگی میں بھی آیا۔ کرشنا آج۔ آئی۔ اے۔ ایس میں پہلا آیا تھا۔ اُس کی تصویریں اِدھر اُدھر دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹی۔ وی۔ ریڈیو پر اُس کی خبریں بکھر رہی تھیں۔ اُس کے گھر پر مبارکباد دینے والوں کی قطار لگی تھی۔ انٹرویو ہونے لگے۔ بڑی دھوم دھام خوشیاں ہی خوشیاں۔ وہ سوچتی جو خواب اُس نے دیکھا تھا اور روشن گیند اُس سے دور بھاگتی جا رہی تھی۔ آج وہی روشن گیند اُس کے ہاتھوں میں چمک رہی ہے۔

پھر اچانک وہ روشن گیند اُس کے ہاتھ سے نکل کر اوبڑ کھابڑ بنجر زمین پر لڑھکتی چلی گئی۔

کرشنا اچانک بول اُٹھا۔ ''ماں! آج پتا جی ہمارے ساتھ ہوتے تو ہماری خوشیوں میں شریک ہو کر وہ بھی کتنا خوش ہوتے۔ اگر پتا جی کہیں ہوں تو اُنھیں بلا لو۔ اُن کا پتہ صرف تم جانتی ہو۔''

اُسکی آنکھوں سے دو بوندیں گریں اور اُس کے سرخ سرخ گالوں پر یوں لڑھکتی چلی گئیں جیسے اُس کے ہاتھ سے روشن گیند چھوٹ کر بنجر زمین پر لڑھکتی چلی جا رہی ہو۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

ایک لوفر

بارش کی آمد ہم کسانوں کیلئے خدا کی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ جیسے جیسے نیلگوں آسمان اُجلے اُجلے بوندز مین پر گرتے ہیں تو ویسے ویسے کالی کالی زمین ہری بھری ہوتی جاتی ہے۔ بارش تھم تھم برستی ہے تو ہری بھری زمین لالہ زار ہو جاتی ہے۔ ہر طرف بھونرے بھنبھناتے ہیں۔ رنگ برنگی تتلیاں اُڑ پھرتی ہیں۔ ساری فضاء معطر ہو جاتی ہے۔

ہمارے کھیتوں کا بھی یہی حال تھا۔ بارش برسی تو دیوالی نہیں تو ہولی۔ ہولی و دیوالی کے ہماری زندگی گذر رہی تھی کہ ہمارے گاؤں کے قریب سے بہنے والی ندی پر سرکار نے ایک باندھ باندھنے اعلان کیا۔ لوگ سوچتے تھے کہ کیسا ہوگا یہ کام؟ کچھ سوچتے تھے کہ ہماری زمین ہڑپ کرنے کا گُر ہے گاؤں خالی کرانے کا بھی۔

گاؤں پہاڑ کی ترائی میں تھا۔ گاؤں کے پیچھے پہاڑ کسی محافظ کی طرح سینہ تانے کھڑا تھا۔ پہ کے قدموں میں ندی بہتی تھی۔ تھوڑی دور پر ندی دو اونچے اونچے پہاڑی ٹیلوں کے بیچ سے گذرتی تھی انجینئروں نے ان دونوں ٹیلوں کو ملا کر باندھ بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ گاؤں کے بہت سارے لوگ کے خلاف تھے۔

مخالفت بڑھنے لگی تو میرے باپ نے حمایت شروع کردی۔ اُس نے لوگوں کو سمجھایا کہ باند بننے سے بہت سارے کسانوں کو فائدہ ہوگا۔ باڑھ نہیں آئے گی اور پھر سرکار ہماری زمینوں کے اچھے بھی دے گی۔ موافقت اور مخالفت دونوں تھی۔ سرکار پھر سرکار ہے وہ کب ماننے والی۔ ایک دن بلڈوز فوج پھاٹا آدھمکا۔ گاؤں خالی کر کے ہمیں ایک نئی بستی میں ڈھکیل دیا گیا جو کھیت مالک تھے وہ مزدور گئے۔ میرے ماں باپ کسان تھے۔ میں بھی کسان تھا۔ کسان کا بیٹا کسان ہی بن سکتا ہے کپتان نہیں سکتا، ایسا میرے ماں باپ سوچتے تھے۔ گاؤں کے بچے، نوجوان، بوڑھے، عورتیں سب باندھ پر مزدو کرنے لگے۔ پتھر ڈھونے لگے تھے لیکن میرے ماں باپ نے کھیتوں میں کام کرنا پسند کیا۔ میں بھی کے ساتھ ہی بھڑ گیا۔

www.taemeernews.com

ایک دن کھیت مالک نے مجھے کیڑے لگے گنے کے پودوں کی کونپلیں کاٹنے کا کام دیا۔ مجھے بتایا کہ جس پودے کے پتے پیلے ہو گئے ہوں اُنھیں زمین سے ایک بالشت چھوڑ کر تراش لوں۔ صبح سے شام تک میں کام میں لگا رہا۔ چھٹی ہوتے ہوتے میرے بازوؤں پر گنے کے پتوں پر لگے باریک نوک دار کانٹوں نے خراشوں کے ایسے نشان چھوڑے جیسے کسی ماہر تلوار باز نے ہلکے زخم تراش دیئے ہوں۔ یہی حال پنڈلیوں کا بھی تھا بازو اور پنڈلیاں لال بھبھوکا بن گئے تھے۔ جب گھر پہنچا تو ماں نے زخموں پر ناریل کا تیل مل دیا۔ ماں کے پاس ہر زخم کی یہی ایک دوا تھی۔ ماں کے ہاتھ کا پیار بھرا لمس تھا کہ تیل ملتے ہیں مجھے بہت راحت محسوس ہوئی۔

میں سوچنے لگا۔ یہ کام بہت مشکل ہے۔ کل سے میں یہ کام نہیں کروں گا۔ دوسرا کوئی کام تلاش کرلوں گا۔ بہت سارے لوگ شہر میں جا کر کام کرتے ہیں۔ میں بھی شہر چلا جاؤں گا۔ مجھے بابولال یاد آیا جو شہر میں کام کرتا تھا اور کبھی کبھی گاؤں آتا تھا۔ آج کل وہ آیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا صبح اُس سے ضرور ملوں گا۔ یہی سب سوچ رہا تھا کہ نیند نے اپنا جادو چلا دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کل کے زخم باریک باریک کالی لکیروں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ تکلیف ختم ہو چکی تھی۔ میں نے منھ ہاتھ دھوئے اور بابولال کی کھوج میں نکل پڑا۔

بابولال عمر میں مجھ سے بڑا تھا لیکن میرا دوست تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلے کودے تھے۔ اسکول کے بہانے کھیت کھلیانوں، امرائیوں، جام کے باغوں اور گنے کے کھیتوں میں وقت گذارتے، شام کو گھر پہنچتے۔ ہماری بدمعاشی کی خبر گھر والوں کو ہوئی تو اُنھوں نے کام پر جوت دیا۔ بابولال شہر بھاگ گیا۔

بابولال ایک جگہ مل گیا۔ میں نے بابولال سے کہا۔ ''یار! بابولال!! یہ کھیتی ویتی کا کام مجھ سے نہیں ہوگا۔ سالا یہ بڑا انکل پچو کام ہے۔ بالکل ان پھٹ ہے۔ مجھے کوئی دوسرا کام دلا دے، شہر میں۔'' بابولال نے اپنا سر کھجایا۔ ٹھنڈی ملی۔ پھر کان پر اُنگلی رکھ کر بولا۔ ''ہاں یار! یہ کام بڑا انٹ سنٹ ہے۔ سالا میں بھی اس کام سے دور بھاگتا ہوں۔'' کچھ لمحے سوچ کر بولا۔ ''تو میرے ساتھ سہر چل کوئی نا کوئی تکڑم کرلیں گے۔ سالی اپنی جندگی بھنورے کی طرح ہوگئی ہے۔ جس طرح ڈور بھنورے کو پھراتی ہے اسی طرح گریبی اپنے کو نچاتی ہے۔ مگر بچو تو چنتا مت کر، گذار کر ہی رہیں گے۔'' بابولال نے میری پیٹھ تھپتھپا کر ڈھارس بندھائی۔

دوسرے دن میں بابولال کی چرخ چوں کرتی سائیکل پر ڈبل سیٹ شہر آ گیا۔

www.taemeernews.com

بابولال سائیکل دوکان پر پنچر بنانے کا کام کرتا تھا اور گاہکوں کی سائیکلوں میں پمپ سے ہوا بھرتا تھا۔ ہوا بھرنے کا آٹھ چار آنا اُسے مل جاتا تھا۔ سائیکل کے دوسرے کام کرنے کیلئے دوسرا آدمی تھا جسے بابولال اُستاد کہتا تھا۔ میں شام تک شہر میں بھٹکتا رہا۔ دوکان پر واپس آیا تو بابولال کی چھٹی ہو چکی تھی۔ اُس نے ہوا بھرنے سے پانچ سات روپے کما لیے تھے۔ سیٹھ نے اُسے پانچ روپیہ اور دیا تھا۔ بابولال کی جیب گرم تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ''چل کچھ کھا پی لیتے ہیں۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چلنے لگا۔ ہم دونوں ایک نیم تاریک گلی میں پہنچے۔ ایک دروازے کے سامنے رُک کر اُس نے دروازے سے ٹیک لگائے سوئی ہوئی عورت کو آواز دی۔ ''ماوسی۔ اے ماوسی!'' ماوسی ملگجے اُجالے میں مٹی کا ڈھیر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی اور ہنسنے لگی تو اُس کے دانت چمک گئے لیکن اُس کا چہرہ اندھیرے میں ہی چھپا رہا۔

ماوسی نے آواز دی۔ ''سانتی! اے سانتی!! دروجا کھول۔ بابو آیا ہے۔'' دروازہ کھلا۔ سامنے ایک دبلی پتلی دھان پان لڑکی کھڑی تھی۔ قد و خال تیکھے تھے۔ ناک نوک دار تھی۔ ہونٹ پان کی وجہ سے لال لال تھے۔ اُس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا اور دروازہ بند کر لیا ماوسی باہر چلی گئی تھی۔ شاید وہ پہلے جیسے ہی سو گئی تھی۔ شانتی نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو بابولال جھٹ بولنے لگا۔ ''یہ رحمان ہے۔ رحمان بھائی، مسلمان ہے۔ میرے ساتھ کام کرنے آیا ہے۔۔۔۔ چل جلدی کر کچھ کھلا پلا۔'' لڑکی اندر کی کھولی میں گئی۔ گلاس اور بوتل لے آئی۔

میں نے بابولال سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

بابولال بولا۔ ''یہ دکھ درد کی دوا ہے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تجھے کون سا دکھ درد ہوا ہے۔ بھلا چنگا تو ہے!''

بابولال ہنسا اور کہنے لگا۔ ''تو نئی سمجھے گا بچو جانے کو۔ سالا یہ جانا بڑا ریڈی ہے۔ گرہی کو تانتا چلا جاتا ہے۔''

بابولال کی بات میں سمجھ نہیں سکا۔

بابولال نے شانتی کے ہاتھ سے گلاس اور بوتل لے لیے۔ بوتل سے گلاس بھرا اور غٹا غٹ پی گیا۔ پینے کے بعد وہ منہ تیڑھا میڑھا بنانے لگا جیسے اُس نے کوئی کڑوی کسیلی چیز کھالی ہو۔ شانتی نے ایک طشتری میں نمک کے کھڑے لا کر رکھ دیئے۔ بابولال نے دو دانے اُٹھا کر منہ میں پھینکے اور اُنھیں گھولنے لگا۔

www.taemeernews.com

کچھ دیر بعد شانتی بولی۔ "اپنے دوس کو بھی دے گا۔ ساری کھد ڈھوس لے گا۔ جرا دوسرے کا بھی کھیال کر۔"

بابولال چونکا۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ "پیئے گا؟" میں نے انکار میں گردن ہلا دی۔

بابولال کہنے لگا۔ "ارے بدھو! یہ سوم رس ہے۔ اسے بھگوانوں نے بنایا ہے اور خوب پیا ہے۔ جب یہ پیٹ میں پہنچتا ہے تو پینے والا ناچنے لگتا ہے۔۔۔"

بابولال نے ہاتھ اوپر کر کے ہاتھوں کو جھٹکانا اور کمر کو مٹکانا شروع کر دیا تو میں اور شانتی ہنسنے لگے۔ بابولال ہماری ہنسی کی آواز سُن کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ پھر مسکرایا۔ "بدھو بابیہ! تو بھول گیا کہ تو بھی بھائی جتا کے جتا کا مسلمان ہے۔ دارو نئی پیتا۔ بس۔" بابولال اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔

بابولال نے آدھا گلاس شانتی کی طرف بڑھایا تو گلاس لے کر اُس نے میری طرف طنز بھری نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ "میں عورت ہو کر پی رہی ہوں اور تم مرد ہو کر پیاسے بیٹھے ہو۔" اُس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کیا اور بابولال کی طرح منہ بنانے لگی۔ پھر نمک کے دو دانے اُٹھا کر منہ میں ڈالے اور گھولنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ اُٹھی۔ ایک کونے میں چولہا جلایا۔ باجرے کی روٹی اور انڈے کی چٹنی بنائی اور ہمارے سامنے لا کر رکھ دی۔

بابولال دو تین گلاس چڑھا چکا تھا۔ دن بھر کی محنت سے مرجھایا ہوا اُس کا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔ وہ کہنے لگا تھا۔ اُس نے شانتی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ شانتی ہے۔ گھر کی بھی شانتی اور میرے من کی بھی شانتی۔" اُس نے شانتی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی چھاتی پر رکھ لیا تھا۔ پھر کہنے لگا۔ "پر ہے سالی بڑی ہوسیار، جب گلاس خالی ہوتا ہے تو کھالی بوتل کے جیسے لڑھکا دیتی ہے۔"

اب وہ جھومنے بھی لگا تھا۔ جھومتے جھومتے وہ بولا۔ "پیتا نئی تو کھانا تو ہوگا۔ چل سُسرو پڑ جا۔ روٹی دے اس کو۔ بھوکا ہوگا۔"

ایک دو گھونٹ چڑھا کر کہنے لگا۔ "چل! کھا شانتی کے ہاتھ کی روٹی اور چٹنی۔ تجھے کہیں نئی ملے گی۔ بھکت بابولال کھلا سکتا ہے۔" اُس نے اپنا سینہ پھلایا اور گردن اکڑا کر سینہ ٹھونکنے لگا۔ جب وہ کہتا تو صحیح کہتا لیکن دوسرے الفاظ بولتا تو اُن کی گردن مروڑ دیتا۔

دارو بابولال کے پیٹ میں پہنچ کر دھما چوکڑی مچا رہی تھی اور میرے پیٹ میں خالی آنتیں قل قل کر رہی تھیں۔ میں نے کھانا شروع کر دیا۔ باجرے کی روٹی اور انڈے کی چٹنی میں ہری مرچ بڑا مزہ دے رہی تھی۔ میری نظریں بابولال پر تھیں لیکن ہاتھ اور منہ اپنا کام کر رہے تھے۔

www.taemeernews.com

شانتی کا چہرہ بھی کمل اُٹھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں لال لال ڈورے تن گئے تھے لیکن وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔ بابولال ہوش کھوتا جارہا تھا۔ اُس کی زبان بھی اُس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ اُس نے شانتی کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھنڈی پکڑی اور اُس کا چہرہ اپنی طرف گھما کر کہا۔ ''سالی! اب ۔۔اُس۔۔ مو۔۔ ئے کے سنگ۔۔۔ نجر آئی نا۔۔۔ تو دیکھ لینا۔۔۔ یہ ہا۔۔ بابیہ۔۔ک۔۔ کیا کرتا ہے۔۔۔'' پھر وہ شانتی کا ہاتھ پکڑے پکڑے ہی لُوھک گیا۔

شانتی نے تھوڑی روٹی کھائی۔ پانی پیا۔ اپنی ساڑی اُتار کر الگنی پر ڈالی اور بابولال کے بازو میں لیٹنے لگی تو بولی۔ ''تو اندر کی کھولی میں سوجا۔'' میں نے کھولی کے اندھیرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تو اور بابولال اندر سو جاؤ۔ میں بابولال کو اُٹھا کر اندر ڈال دیتا ہوں۔'' پھر میں نے بابولال کو اُٹھا کر اندر ڈال دیا۔ واپس آیا تو شانتی مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھالیا۔ میں نے غور سے شانتی کی طرف دیکھا۔ جوانی کی بیل اُس پر چڑھ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ چہرے پر بڑا نمک تھا۔ پہلی نظر میں متوجہ کرنے کی ساری خوبیاں اُس کے چہرے پر تھیں۔ مجھے اچانک اُس کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوئی اور میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ بابولال ایسا کیوں کہہ رہا تھا؟ اور وہ یہاں کیسے پہنچی۔ میں نے اُس سے پوچھا تو وہ رونے لگی۔ روتے روتے بولی۔ ''مالوم نئی۔ بس یہ عورت میری ماوسی بھی ہے اور دشمن بھی۔ چھوٹی تھی تو بھیک منگواتی تھی۔ اب سیانی ہوگئی تو بکواتی ہے۔ دن رات کھاتی ہے۔ موٹی ہوتے جاتی ہے۔'' پھر وہ ہنسنے لگی۔ بولی۔ ''یہ بابیہ بھی کچھ نئی کرتا۔ کس کے ساتھ رہوں گی۔ مالوم نئی۔'' رُک کر بولی۔ ''چل اپن دونوں بھاگ چلتے ہیں۔ اس نرک سے تو مجھے چھٹی ملے گی۔''

جب اُس نے بھاگ چلنے کی بات کہی تو میرے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی اور میرے بدن پر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں اُس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ اُس نے انگڑائی لی تو اُس کی مختصر سے چولی نے اُس کے سینے کا ساتھ چھوڑ دیا وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگی اور میری بانہہ پکڑ لی۔

میں نے جس طرح بابولال کو اُٹھایا تھا اُسی طرح شانتی کو اُٹھالیا۔ وہ کچھ اور بجھ کر زوروں سے ہنسنے لگی۔ میں نے اُسے کھولی میں لے جاکر بابولال کے بازو میں پٹخ دیا۔ وہ منہ بسورنے لگی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''پٹخنا ہی تھا تو اُٹھایا کیوں؟''

رات بھر نیند کی لہریں سمندری لاٹوں کی طرح آتی جاتی رہیں۔ صبح صبح نیند نے دبوچا تو چند لمحوں بعد ماوسی نے آدبوچا۔ اندر آکر ماوسی نے مجھے لات مار کر جگایا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ شانتی کو آواز دی تو شانتی آنکھیں ملتی آئی۔ ماوسی نے اُس کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ وہ اندر گئی اور بابولال کی جیب میں

www.taemeernews.com

[پ]یسے تھے سب نکال لائی۔ ماوی کالی تو تھی ہی۔ غصے میں اور بھی کالی بھجنگ نظر آنے لگی۔ چلانے لگی۔ "اس رے کے سات جندگی کھراب کرے گی، اری اتی دمڑی میں ایک دن نئی گجرتا، کھاتا پیتا، سوتا سب کرتا ٹ۔ نکال بھڑوے کو تو نئی نکالے گی تو میں دولات مار کر ہکال دیتی۔ سمجھی۔"

ماوی کی چیخ پکار سے بابولال بھی اُٹھ بیٹھا۔ باہر آ کر بولا۔ "کیوں بوم مارتی ہے۔ تجھے پیسہ نا۔ لے۔" اُس نے پتہ نہیں کہاں سے پچاس کی پتی نکال کر ماوی کے منہ پر ماردی۔ ماوی نے ہنستے ے نوٹ اُٹھا لیا۔

بابولال بولا۔ "چل جلدی سے ہمارے نہانے اور ناستے کا بندوبست کر۔ سالی آئی بڑی پیسے [و]ارے پیسہ مُرگی نہیں کھاتی۔ بابیہ سے پنگا لینے چلی ہے کالی۔" وہ بھی ہنسنے لگا۔

ناشتہ پانی کر کے ہم دونوں بابولال کی دوکان پر آئے۔ راستے بھر بابولال میرے کان کھاتا یہ ماوی ہے نا بڑی نمک حرام ہے۔ سالی شانتی بھی ویسی ہے۔ اب دیکھنا ماوی موٹے کو بلائے گی۔ ں سالے دونوں کا کھیل کھتم کرتا ہوں۔" راستے میں ایک بنئے کی دوکان ملی۔ بابولال دوکان مالک ت کرنے لگا۔ پھر مجھے بلا کر بولا۔ "کل سے یہاں کام پر آجانا بھیڑو۔ یہ اپنا سیٹھ تجھے دس روپیہ ے گا۔" سیٹھ نے مسکرا کر کہا۔ "پر چوری ماپھ نہیں ہوگی۔"

سائیکل دوکان پر ہوا بھرانے والوں کی اور دوسرے گاہکوں کی بھیڑ تھی۔ بابولال کام میں یا۔ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ بہت دیر بعد میں بابولال کے پاس گیا تو اُس نے الگ لے جا کر مجھ ۔ "تو شانتی کے گھر جا۔ دیکھنا وہاں کون ہے۔ ہے بھی یا اُس موٹے کے ساتھ میٹنی میں گئی ہے۔ ر کھبر دے۔ آج اُس کا کھیل کھتم کرتا ہے۔" میں شانتی کے گھر کی طرف نکل گیا۔ باہر سے دروازہ میں تذبذب میں پڑ گیا کہ دروازہ کھولوں یا نہیں۔ ہمت جٹا کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ور ایک ادھیڑ عمر موٹا آدمی بیٹھے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں گلاس تھے۔ میں نے جلدی سے بھیڑا اور بابولال کو خبر دینے دوڑ پڑا۔ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھول گئی تو میں ایک درخت ے لگا کر کھڑا ہو گیا۔

ابھی میری سانسیں درست بھی نہیں ہوئی تھیں کہ بابولال دوڑتا ہوا میرے نزدیک آیا اور کیا ہوا؟" میرا سینہ پھول پچک رہا تھا مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ بابولال نے غصے میں آ کر میرے لئے اور دوسرے ہاتھ سے چاقو لہرا کر کہا۔ "بولتا کیوں نہیں سالے۔ کردوں تیرا بھی تیاپانچہ۔ بول " میں نے دھیرے دھیرے کہا۔ "اندر وہ دونوں بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں گلاس تھے۔۔۔۔" میرا اتنا

www.taemeernews.com

کہتا تھا کہ بابولال کھلا چاقو لے کر دوڑ پڑا۔

میں دھیرے دھیرے سائیکل دوکان کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے میں ماوسی ہاتھ میں سامان کا جھولا لئے لنگ مٹک چل رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اُسے ساری بات بتائی تو وہ چیختی چلاتی گھر کی طرف دوڑ گئی۔ میں نے سائیکل دوکان کا راستہ چھوڑ دیا اور ندی کی طرف نکل گیا۔ میرا پورا بدن پسینہ چھوڑ رہا تھا۔ کپڑے بھیگ گئے تھے۔ ندی میں جا کر میں نے کپڑے اُتارے اور پانی میں ڈبکیاں لینے لگا۔ مجھے کچھ راحت محسوس ہوئی۔ کئی گھنٹے اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد میں سائیکل دوکان پر پہنچا تو اُستاد مجھے دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "تیرا نام رجو ہے؟" میں نے ہاں میں گردن ہلا دی۔ اُستاد مجھے الگ لے جا کر بولا۔ "بابولال حوالات میں ہے۔ اس نے تجھے بلایا ہے۔ جا کر مل لے۔" اُستاد نے مجھے پانچ روپیہ دیا اور تاکید کی کہ سنتری کو دینا۔ تب ہی وہ ملنے دے گا۔"

میں تھانے پہنچا تو ایک ڈاکو صورت مچھو حولدار نے مجھے ٹوکا۔ "اے! کدر جاتا ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "وہ۔ بابولال ہے نا میرا دوست وہ اندر ہے۔ ملنے جا رہا تھا۔" حولدار ہنسا اور بولا۔ "تو بھی اُس کا جوڑی دار ہے چل تو بھی اندر۔" حولدار کے میرے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے پانچ کی پتی جیب سے نکالی تھی اور اُسے بڑی کر کے ہاتھ میں دھر لیا تھا۔ جب وہ میرے نزدیک آیا تو میں نے گاندھی جی کا مسکراتا ہوا چہرہ حولدار کی طرف کر دیا۔ حولدار گاندھی جی سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ اُس نے میرے ہاتھ سے نوٹ جھپٹ کر کے موڑ دیا اور گاندھی جی کو چھپا لیا۔ نوٹ جھٹ سے جیب میں اڑس لی۔ پھر بولا۔ "چل۔" حوالات کے قریب پہنچ کر پہرے دار کو آواز دی۔ "اے تکیا! اس کو ملنے دے اروپی سے" حولدار کی آواز سن کر بابولال سلاخوں کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور اشارے سے نزدیک بلایا۔ میں اس کے قریب گیا۔ بابولال ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں نے پوچھا "کیا کر ڈالا تو نے؟" وہ ہنسا اور بولا۔ "کر دیا سالوں کا کھیل ختم۔ ایک کا پیٹ پھاڑ دیا اور سالی شانتی کی ناک اور بال کاٹ لئے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے اپنی پتلون کی جیب سے لال لال پڑیا نکالی اور بالوں کا ایک گچھا مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ سنبھال کر رکھنا۔ سالی کے بال اور ناک ہی مجھے پسند تھے۔"

میں نے کہا۔ "بال تو ٹھیک ہے چل جائیں گے مگر ناک سڑ جائے گی۔ کیڑے پڑ جائیں گے۔" بابولال پھر ہنسا اور بولا۔ "اچھا تو ایسا کر ناک کو ڈبیہ میں رکھ کل مجھے لا دینا عدالت میں۔"

دوسرے دن میں عدالت گیا تو بابولال کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں تھیں۔ پھر بھی بندوق بردار بندوق لئے چوکنے تھے۔ میں نے بابولال کو ڈبیہ دی۔ اُس نے کھول کر دیکھا تو اُس میں کیڑے کلبلا رہے

www.taemeernews.com

تھے۔ انھیں دیکھ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ پولس والے بھی اُسے شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں دھیرے دھیرے گیٹ کی طرف کھسکنے لگا۔ وہاں سے نکل کر میں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے میں کھیتوں میں پہنچ گیا۔ جہاں میرے ماں باپ کام کر رہے تھے۔ پھر کبھی میں نے شہر کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ شہر جانے کی خواہش کو بابو لال کے آخری منظر نے مار ڈالا تھا۔

برس بیت گئے بابو لال کا پتہ نہیں چلا۔ جب کبھی مجھے بابو لال کی یاد آتی ہے تو آخری منظر ذہن کے نہاں خانے سے اُبھر آتا ہے اور بابو لال کی جاندار ہنسی گونجنے لگتی ہے۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

ماضی

حاجی تراب علی کا محلے اور آس پاس کے علاقوں میں کافی دبدبہ تھا۔ گلی محلے کے چھوٹے بڑے کاموں کے لیے لوگ حاجی تراب علی خان کے پاس آتے تھے۔ بلدیہ کا کام ہو کہ پولیس اسٹیشن کا۔ حاجی تراب علی خان کا نام لینا کافی تھا۔

حاجی تراب علی خان فریضۂ حج سے لوٹے تو شہر بھر میں اُن کا چرچا ہوا۔ چرچے کی وجہ اُن کا شاندار استقبال تھا، جو شہر سے تھوڑی دور جا کر کیا گیا تھا۔ استقبال اور محلے بھر میں چراغاں کرانے کے حاجی تراب علی کے باپ حاجی محرم علی نے خوب پیسہ لٹایا تھا۔ اُنھیں پیسہ خرچ ہونے کا غم نہیں تھا بلکہ خ اس بات کی تھی کہ اُن کا لاڈلا جو کہ فریضۂ حج پر جانے سے پہلے شہر کا ایک بدنام ترین شخص تھا، اب وہ نیک، پاک صاف اور اچھا انسان بن کر آ رہا ہے۔ محرم علی ہر نماز کے بعد اللہ سے دُعا مانگتے تھے کہ وہ ان لاڈلے بیٹے کو نیک انسان بنا دے۔ شائد اللہ نے اُن کی دُعا قبول کر لی تھی کیونکہ جب کبھی وہ مکہ شریف فون لگا کر تراب علی سے باتیں کرتے تو وہ بڑا خوش معلوم ہوتا تھا۔ مناسک حج کی ادائیگی اور سکون قلب باتیں کرتا تھا۔ اِدھر وہ جو محرم علی پھولے نہیں سماتے تھے۔ اور تراب علی کو ہدایتیں دیتے۔ ساتھ ہی اچھی چیزوں کی فہرست بھی لکھاتے تھے۔ تاکید کرتے تھے کہ ان چیزوں کیساتھ آبِ زم زم اور عراقی کھجور شہد ضرور لانا۔ ویسے تو ان کے گھر میں اللہ کا دیا اور مکہ مدینہ سے لایا ہوا بہت سارا سامان ابھی تک پکا رکھا تھا لیکن وہ تراب علی کا حوصلہ بڑھانے کیلئے اچھا خاصہ خرچ کرا رہے تھے۔ تراب علی خود بھی کھلے ہاتھ کا آدمی تھا۔

حج پر جانے سے پہلے ہر رات اُس کے ساتھ رات کے کھانے پر پانچ سات آدمی ہوتے تھے۔ یہی آدمی رات کے دو پہر میں اُسے کانچ کے برتن کی طرح سنبھال کر گھر پہنچاتے تھے۔ وہ ہر روز خوب مزے لوٹتا تھا اور شاہ خرچی بھی کرتا تھا۔ وہ اپنے دو تین رازداروں کیساتھ شہر کی کسی گمنام سی لاج میں اپنی لاج بھی کھو آتا تھا۔ اُس کے رازدار آئے دن اُس کی لاج کھونے کا بندوبست کرتے تھے۔ ان سب

www.taemeernews.com

کارناموں سے وہ شہر میں ناپسندیدہ شخص بن گیا تھا۔ سماج اور مذہب سے وہ نامعلوم دوری پر تھا۔ سماج میں سانس لیتے ہوئے وہ غیر سماجی جانور بنا ہوا تھا۔

جب تراب علی کی چاند راتیں شباب پر تھیں اُن ہی دنوں تراب علی زیادہ مشہور ہوا۔ اُس کا بے چین دل دھڑ دھڑ دھڑ کنے لگا۔ اُس کی منچلی نظر ایک پری چہرہ گلاب سی رنگت والی دوشیزہ پر ٹھہر گئی۔ نظر ٹھہرتے ہی دھڑکن کی رفتار بے لگام ہوگئی اور اُس کے بدن سے در در پسینہ ایسا چھوٹا جیسے وہ بارش میں بھیگ گیا ہو۔ تراب علی نے اپنے رازداروں کو بتایا تو اُنہوں نے دو تین دن میں ہی پتہ چلالیا کہ لڑکی کا نام شمع ہے وہ شہر کے بہت ہی معزز گھرانے کے مالک خان اعظم کی بیٹی ہے۔ اسکول میں زیر تعلیم ہے۔ اُس کے گھرانے میں ڈاکٹر، انجینئر، انسپکٹر ہیں۔ تراب علی کو شمع کے گھرانے کی شرافت اپنے باپ کی دولت کے مقابلے میں پہاڑ سی اونچی نظر آئی۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ شمع کی دو بڑی بہنیں کالج کی اونچی جماعتوں میں تعلیم حاصل کررہی ہیں تو تعلیم کے سلسلے میں بھی تراب علی کا خاندان بہت بونا نظر آیا۔ تراب علی کے گھر کی الماریوں میں نوٹ کے بنڈل بھرے تھے لیکن کسی بھی طاق میں کلام مجید کے علاوہ ایک کتاب یا ایک کاغذ کا پرزہ بھی نہیں تھا۔ بس اللہ نے محرم علی کو نواز دیا تھا اور اللہ کی ان نوازشوں کا ناجائز استعمال تراب علی کررہا تھا۔

جب سے تراب علی نے شمع کو دیکھا تھا بھونرے کی طرح بے چین تھا۔ وہ شمع کی گذرگاہوں سے گذرتا۔ اسکول کے چکر لگاتا اور اُس کے گھر کا طواف کرتا۔ ایسا کرنے میں اُس کے اضطراب قلب میں مزید اضافہ ہوجاتا۔ اپنے نرم بستر میں اُسے کانٹے سے محسوس ہوتے اور وہ کسی زخمی کی طرح تڑپتا۔ اسی اضطراب میں اُس کے رتجگوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔

حاجی محرم علی کو بھی دور نزدیک سے سُن گُن لگی تھی کہ بیٹا باپ کی دولت کو پانی کے ساتھ ملا کر پی رہا ہے۔ صبح سے شام تک ہزاروں لُٹا رہا ہے۔ دولت لُٹانے کے بعد بھی بے چین ہورہا ہے۔ نہ جاگ رہا ہے نہ سو رہا ہے۔ وہ سوچنے لگے کہ تراب علی کا کیا علاج کرنا چاہیئے۔

تراب علی کی حالت پاگلوں جیسی ہوتی جارہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں موم شمع جلا کر دیوانوں کی طرح ہنستا تھا۔ کئی بار تو اُس نے جلتی شمع کو بے خودی میں پکڑ بھی لیا تھا۔ اسی وجہ سے اُس کے ہاتھ کی انگلیاں جھلس گئی تھیں اور وہ سی کر کے رہ گیا تھا۔

تراب علی نے شمع کے فون نمبر بھی معلوم کرلیے تھے۔ وہ اُسے فون کرنے لگا۔ بار بار فون کرنے کی وجہ سے شمع کے باپ خان اعظم نے محکمے سے معلوم کرلیا کہ بار بار فون کہاں سے آتے ہیں۔

www.taemeernews.com

معاملہ حاجی محرم علی کے سامنے آیا تو وہ حیران رہ گئے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ تراب علی کے دوستوں کے کہنے پر اُنہوں نے خان اعظم سے رابطہ پیدا کر کے اپنے لڑکے کی شادی شمع سے کر دینے کی درخواست کی۔ اس بات پر شمع کے خاندان والے اور بھی چراغ پا ہو گئے اور صاف انکار کر دیا اور تنبیہ بھی کی کہ آئندہ تراب علی کی طرف سے ایسی نامناسب بات ہوئی تو وہ محرم علی کے خلاف کاروائی کریں گے۔

تراب علی کی بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسی اضطراب میں اُس نے ایک دن شمع کو اغوا کر لیا۔ چھوٹے سے شہر میں یہ واقعہ غیر معمولی تھا۔ شمع کا خاندان بڑا معزز تھا۔ شمع کے باپ خان اعظم سے محرم علی بہت دولت مند تھے لیکن وہ سماجی عزت اور وقار سے محروم تھے۔ شہر میں بڑا ہنگامہ ہوا۔ بات پولیس تک پہنچی۔ چند ہی گھنٹوں میں شمع گھر پہنچ گئی اور تراب علی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ محرم علی پانی کی طرح روپیہ بہا رہے تھے لیکن خان اعظم کے دبدبے اور وقار کے مقابلے میں محرم علی کا روپیہ پیسہ تراب علی کے گناہوں کے داغ مٹانے کیلئے ناکافی ہو رہا تھا۔ آخر محرم علی کو شہر کے سماجی بزرگوں کا سہارا لینا پڑا اور پنچایت میں فیصلہ کرنے کی بات شمع کے خاندان والوں کے پاس پہنچائی گئی۔ معاملہ لڑکی ذات کا تھا۔ معاملے کو طول دینے پر کورٹ کچہری کی نوبت آتی اس لئے شمع کے والد خان اعظم نے بزرگوں کی بات مان لی۔ تراب علی کو سلاخوں سے باہر نکال لیا گیا۔

دوسرے دن خان اعظم کے مکان پر پنچایت بیٹھی۔ شہر کے معزز اور معتبر لوگوں نے پہلے تو محرم علی کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ محرم علی نے معافی طلب کی اور خوب گڑگڑائے۔ اپنے بیٹے تراب علی پر رحم کرنے کی درخواست کی۔ خان اعظم کے خاندان والے بہت ہی برہم تھے۔ لیکن خان اعظم کے احترام میں وہ خاموش تھے۔ خان اعظم نے سمجھا دیا تھا کہ معاملہ لڑکی کا ہے۔ جتنا کھینچو گے اُتنا ہی پھیلے گا۔ اُنھیں معلوم تھا کہ ہمارا سماج ایسا ہے کہ جب ایک بار کسی خاندان کی بیٹی پر اُنگلی اُٹھتی ہے تو برسوں تک اُنگلیاں اُٹھتی چلی جاتی ہیں۔

رات دیر گئے تک پنچایت جاری رہی۔ محرم علی کے گڑگڑانے اور معافی طلب کرنے پر پنچوں کا رویہ تبدیل ہوا کیونکہ محرم علی بھی شہر کے ایک رئیس تھے۔ اس لئے پنچوں نے آپس میں کھسر پھسر کر کے فیصلہ سُنا دیا کہ شمع اور تراب علی کو رشتہ ازدواج میں باندھ دیا جائے۔ خان اعظم جہاندیدہ تھے۔ اُنہوں نے پس و پیش کے بعد پنچوں کی بات مان لی لیکن شرط بھی رکھی کہ تراب علی اپنے عادت و اطوار کا محاسبہ کرے اور نیک انسان بن جائے تب ہی وہ شمع کا نکاح پڑھوائیں گے۔ حاجی محرم علی نے اُن کی شرط مان لی اور

www.taemeernews.com

چند دنوں میں تراب علی کو سیدھا کرنے کا وعدہ کرلیا۔ دُعا کیساتھ پنچایت ختم ہوگئی۔

تراب علی نے اچھے چال چلن دکھانے شروع کردیئے۔ وہ بڑے ہی خشوع و خضوع سے نمازیں ادا کرتا۔ چند ماہ پہلے اُس کی بدچلنی کے چرچے تھے لیکن اب اُن چرچوں پر نیک چلنی غالب ہوتی جارہی تھی۔ چند مہینوں بعد ہی شمع تراب کے گھر روشنی بکھیرنے آگئی۔

خوبصورت، نیک سیرت شمع نے اللہ کی مرضی کو قبول کر کے تراب علی جیسے بگڑے نوجوان کو اپنا خدائے مجازی تسلیم کرلیا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ تراب علی کے اندر بسی برائیاں ختم کرے گی اور اب تو تراب علی ایک نیک انسان بن گیا تھا۔

تراب علی نے جب آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو دولت کے ڈھیر پر پایا۔ بچپن سے ہی وہ بگڑا نواب بن گیا تھا۔ نت نئے پھولوں کی خوشبو سونگھنے کی عادت اتنی جلد چھوٹنے والی نہیں تھی۔ وہ بہت جلد یکسانیت سے اوب گیا۔ سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں ہی اُس نے مسجد والی سڑک چھوڑ کر رنگوں والی پگڈنڈیوں پر دوڑنا شروع کردیا۔ شمع اُسے جتنا سمیٹنے کی کوشش کرتی وہ اُتنا ہی بکھرتا جاتا۔ اب اُس کی بدچلنی کی دھول اُڑ کر چند دنوں پہلے کی نیک چلنی پر جمنے لگی تھی۔ محفلوں میں اُس کے چرچے ہونے لگے تھے۔ لوگ کہتے کہ خوبصورت، نیک سیرت بیوی بھی تراب علی کو نہیں بھائی اور وہ بیوی جس کیلئے وہ پاگل ہو اٹھا تھا۔ لوگ اُس کے باپ کی دولت کو دوش دیتے۔ گڑے مردے اُکھاڑتے۔ محرم علی کا شجرہ زیرِ بحث جاتا۔

حاجی محرم علی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اچانک سیٹھ بن گیا تھا۔ وہ ایک بڑے بیوپاری کے یہاں معمولی نوکر تھا۔ پانی بھرنا، سودا سلف لانا، دکان کی صاف صفائی کرنا، بیوپاری کے ساتھ سفر کرنا اُس کے کام تھے۔ ایک بار دورانِ سفر سیٹھ کا ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوگیا۔ موقع کو غنیمت جان کر محرم علی نے نوٹ سے بھرا بیگ پار کرلیا۔ اور چند دنوں بعد اس شہر میں آبسا۔ روپئے کے ٹیکے سے اُس کا کاروبار چل نکلا۔ اور وہ سیٹھ حاجی محرم علی بن گیا۔ لیکن وہ گمنام تھا۔ جب پہلی بار حج کیلئے روانہ ہوا تو اُس وقت شہر کے دوسرے سیٹھوں کو معلوم ہوا کہ محرم علی نامی سیٹھ بھی کوئی ہے۔ تھوڑی نیک نامی حج سے لوٹنے پر ملی تھی لیکن جلد ہی ڈھیر ساری بدنام شہرت تراب علی کی بدچلنی نے دلا دی۔

شمع نے بھی سسر سے شکایت کی کہ تراب علی کی نیک چلنی اب ختم ہوگئی ہے اب وہ پھر سے پرانے چال چلن پر واپس ہوگیا ہے۔ اُس نے دبی زبان سے میکہ بسانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حاجی محرم علی ایک بار پھر پریشان ہوگئے۔ لیکن اب معاملہ پنچایت کا نہ تھا بلکہ خالص ذاتی تھا۔ اس لئے وہ فکر میں پڑ

www.taemeernews.com

گئے۔ کئی دن غور کرنے کے بعد اُن کی سمجھ میں یہی بات آئی کہ کسی طرح بھی راضی کر کے تراب علی اور ش
کو خدا کے دربار کعبہ اور حضور ﷺ کی عدالت مدینہ منورہ بھیج دیں۔ اگر سدھر گیا تو لاکھوں پائے۔ بگڑ گ
تو ہزاروں کھوئے۔

تراب علی پہلے تو کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ وہ کہتا ابھی تو اُس کے کھانے کھیلنے کے دن ہیں
ابھی سے کھونٹے سے کیوں باندھا جا رہا ہے لیکن محرم علی نے تراب علی کو ایسی پٹی پڑھائی کہ وہ راضی ہو گیا
اس میں شمع کا بھی زور شامل تھا۔

حج کا فارم بھرتے ہی تراب علی نے داڑھی بھی بڑھالی اور بدچلنی کی پگڈنڈی چھوڑ کر مسجد
جانے والی سڑک کا راستہ پکڑ لیا۔ تب سے اب تک حاجی تراب علی نے وہ سڑک نہیں چھوڑی۔ اب تو وہ
سماج میں ایک معزز و معتبر شخص بن گیا تھا۔

ان ہی دنوں مدت کے بعد شہر میں ایک پھر ایک واقعہ گونجا۔

شہر کی جھوپڑ پٹی میں رہنے والے ایک مزدور سلیم نے اپنے پڑوسی محلے کی ایک نوجوان لڑکی کا
اغوا کر لیا۔ کوئی کہتا کہ لڑکی خود سلیم کیساتھ گئی لیکن شہر کے شرفاء اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اُن کی
شرافت اس بات کو ہضم کرنے سے قاصر تھی کہ کوئی لڑکی بغیر شادی کے کسی کے ساتھ جا سکتی ہے۔ لڑکا مزدور
اور لڑکی کا خاندان متوسط ہونے کی وجہ سے شہر میں پھر ہنگامہ مچا۔ جلد ہی معاملہ حاجی تراب علی خان کے
سامنے پیش ہوا۔ لوگوں نے لڑکی اور لڑکے کو بھی پکڑ کر دربار میں پیش کر دیا۔ لڑکا اور لڑکی بڑے مطمئن
دکھائی دیئے حالانکہ لڑکی والوں نے سلیم پر تشدد بھی کیا تھا اُس کے باوجود اُس کے چہرے پر ذرا بھی ملال
نہیں تھا۔

واقعہ بہت سنگین تھا۔ حاجی تراب خان ایسے واقعات کے سخت خلاف تھے لیکن معاملہ گرما
گرمی میں بگڑ کر سلیم کی موت پر ختم نہ ہو اسلئے اُسے دوسرے دن پر ٹال دیا گیا۔ حاجی تراب علی کی باتیں سن
کر نوجوانوں کا غصہ عود کر آیا تھا جو اکثر ایسے موقعوں پر آتا ہے۔ لڑکی کو اُس کے گھر والوں کے سپرد کر دیا گیا
اور سلیم کو سخت الفاظ میں تاکید کر دی گئی کہ وہ شہر چھوڑے اور نہ ہی لڑکی کی گلی کی طرف دوڑے۔ ورنہ برا
حال کر دیا جائے گا۔ دوسرے دن عشاء بعد شریک دربار ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ حاجی تراب علی نماز مغرب سے فارغ ہو کر اپنی داڑھی سہلا رہے
تھے کہ کسی کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ اُنہوں نے اپنی بیٹھک کا دروازہ کھولا تو سامنے سلیم کو کھڑا پایا۔ چند
لمحوں تک وہ سکتے کے عالم میں کھڑے رہے پھر اُسے اندر بلا لیا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دروازہ بند

www.taemeernews.com

یا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''کل عشاء بعد حاضر ہونا تھا۔تم ابھی آ گئے؟'' اتنا کہہ کر وہ سوالیہ
وں سے سلیم کی طرف دیکھنے لگے۔ سلیم نے کہا۔ ''حاجی صاحب بے وقت آمد پر مجھے معاف کریں
ن معاملہ ہی ایسا ہے۔ بس میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ماضی کو بھولے نہیں ہوں گے۔ میرے
ہ خود ساجدہ ہے۔ جبکہ جمن سیٹھانی کے ساتھ ہی سارا شہر آپ کا مخالف تھا۔ آپ اپنے ماضی کو سامنے
تے ہوئے فیصلہ کیجئے۔ میں مزدوری ضرور کرتا ہوں لیکن گریجویٹ ہوں جلد ہی کوئی نہ کوئی اچھی نوکری
جائے گی یا پھر کاروبار کروں گا اور ساجدہ کو زندگی بھر خوش رکھنے کی کوشش کرونگا۔''

پہلے تو حاجی تراب علی کو سلیم پر بہت غصہ آیا لیکن سلیم کی بات سن کر ان کے ذہن میں ماضی کا
ورق کھل گیا۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کے ذہن میں ماضی کی فلم چل رہی ہے۔ سلیم اپنی بات ختم کر کے
نے کیلئے اُٹھا تو بھی وہ خاموش بیٹھے رہے۔ وہ بہت دور اپنے ماضی میں پہنچ گئے تھے۔ اُن کے ماضی کا
ہ دے کر سلیم نے برسوں پہلے سوئے ہوئے جوالا مکھی کو جگا دیا تھا۔ سلیم دروازہ کھول کر کب کر
یرے میں ڈوب گیا تھا لیکن وہ ابھی تک اپنے ماضی کی چاندنی میں کھوئے ہوئے تھے۔

ماضی کا تراب علی جو ایک کھلنڈرا، خمار باز، دل پھینک نوجوان تھا۔ شب باش یار بردوش تھا۔
ج ایک مضبوط دل کا مالک، عبادت گذار بن گیا تھا۔ سماج میں اُس کا اونچا مقام تھا کیونکہ وہ حاجی تراب
خان کہلاتا تھا۔ لیکن اس لڑکے سلیم نے اُسے حال اور ماضی کے دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔ جس کے
طرف سلیم اُس کا ماضی بن کر کھڑا تھا اور ایک طرف اُس کا حال تھا جہاں وہ حاجی تراب علی خان کی
ر شخصیت بن کر کھڑا تھا۔ حال اور ماضی کی کشمکش میں کتنی رات بیتی پتہ ہی نہ چلا۔ جب شمع نے آ کر کہا۔
ت کے تین بجے چکے ہیں اور تم یہاں بیٹھے ہو! کیا کوئی پر پیچ معاملہ سامنے آ گیا ہے جو اتنی گہری سوچ
غرق ہو گئے ہو؟''

حاجی تراب علی مشینی انداز میں اُٹھے اور خواب گاہ کی طرف ہو لیے۔

وہ دن چڑھے تک سوتے رہے۔ اُٹھ کر اُنہوں نے قضاء نمازِ فجر ادا کی۔ خدا سے دُعا مانگی کہ
وں کا جو اعتماد اُنھیں حاصل ہوا ہے۔ اللہ رب العزت اُسے قائم رکھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ پھر
لنگ میں آ بیٹھے اور حال و ماضی میں جھولنے لگے۔

بہت غور و خوض کے بعد اُنہوں نے اپنے ہم رتبہ اور ہم پیشہ چند صاحبان کو بلوایا اور مسئلہ ان
ے سامنے رکھا۔ ان معززین میں ایک اُن کے ماضی شریک بھائی بھی تھے۔ وہ مسکرائے اور بولے۔
حاجی صاحب یہ واقعہ تو بالکل اپنی آپ بیتی معلوم ہوتا ہے۔ معاملہ صاف ہے۔ ساجدہ نامی لڑکی کا نکاح

www.taemeernews.com

شہزادے سلیم سے پڑھوا کر ساجدہ کو اُس کی انارکلی بنا دیا جائے۔"

خشک محفل میں بارش کی پہلی پھوار کی طرح ہنسی کا ایک جھونکا آیا۔ سبھی ہنسنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد حاجی تراب علی بولے۔ "بھائی یہی تو مسئلہ ہے۔ میں کل رات سے الجھا ہوں۔ کل کا تراب علی اور آج کے حاجی تراب علی خان میں لڑائی ہو رہی ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں شہر کے جانکار لوگوں کو بلا کر اُن کی طرف سے فیصلے کی بات رکھیں تا کہ میرا اعتماد بھی بحال رہے اور کام بن جائے۔

شہر کے معززین کی فہرست تیار کی گئی۔ جس میں خان اعظم اور حاجی محرم علی بھی شامل تھے مدرسے کے مفتی، مسجد کے امام اور بہت سارے شہری جمع ہوئے۔ پہلے تو حاجی تراب علی خان سلیم پر بہت بگڑے۔ نوجوانوں کی بدچلنی کی دُہائی دی۔ اُنھیں معاشرے کے بگاڑ کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ محفل میں شریک ایک صاحب بولے۔ "حاجی صاحب تو بہت گرم ہو رہے ہیں۔ لیکن شریک کار یعنی لڑکی کی مرضی معلوم کر لینا چاہیئے کیونکہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ لڑکی راضی بہ رضا لڑکے کے ساتھ جاتی ہے لیکن ہم اُسے اغوا کا نام دیتے ہیں۔"

اُسی وقت ایک خاتون کو بلایا گیا اور لڑکی کی رائے معلوم کرنے کیلئے بھیجا گیا۔ خاتون چند منٹوں میں بتایا کہ ساجدہ اور سلیم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہیں۔ حاجی تراب علی ساجدہ پر بہت برہم ہوئے۔ جب وہ بگڑتے تھے تو محفل خاموش ہو جاتی تھی۔

پنچ حضرات نے حاجی تراب علی خان کو ٹھنڈا کیا اور ایک کمرے میں جا کر رائے مشورہ کرنے کے بعد محفل میں آ کر اپنا فیصلہ حاضرین کو بتا دیا۔

خان اعظم نے کہا۔ "واقعہ تو سنگین نوعیت کا ہے۔ لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سلیم اور ساجدہ کو ملا دیا جائے۔ یعنی ساجدہ کا نکاح سلیم کے ساتھ پڑھوا دیا جائے کیونکہ دونوں کی مرضی یہی ہے۔"

ساجدہ کے متعلقین بھڑک اُٹھے۔ ایک کہنے لگا۔ "ہمارا اور سلیم کا کوئی میل نہیں ہے۔ پھر آپ نے یہ فیصلہ کیسے کیا؟"

محفل میں سناٹا چھا گیا۔ سب لوگ خاموش بیٹھے تھے۔ اُس وقت حاجی تراب علی کے ماضی شریک بھائی کھڑے ہوئے اور بولنے لگے۔ "یہ سچ ہے کہ سلیم اس وقت ایک غریب مزدور ہے لیکن آپ کو معلوم ہے وہ گریجویٹ ہے۔ قابل ہے۔ آج نہیں کل اُسے نوکری مل جائے گی۔ پھر تالی ایک ہاتھ سے

www.taemeernews.com

نہیں بجتی۔لڑکی کی مرضی بھی یہی ہے اور جب تک سلیم کو نوکری نہیں ملتی تب تک وہ حاجی تراب علی کی فیکٹری میں منیجر رہے گا اور فیکٹری کے کوارٹر میں ہی اُسے بسا دیا جائے گا۔تنخواہ بھی معقول دی جائے گی۔ یہ فیصلہ ہم سب نے کیا ہے۔اسی میں ہماری آپ کی بھلائی ہے۔

اس بات پر محفل میں حاضر لوگوں کے چہروں پر اطمینان کی سُرخی آئی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ دن میں ہی حاجی تراب علی نے یہ فیصلہ کرلیا تھا، کیونکہ سلیم اور ساجدہ کے روپ میں حاجی تراب علی اور شمع کا ماضی اُن کے سامنے کھڑا تھا۔اپنے ماضی پر غور کرتے ہوئے اُنہوں نے اپنے ماضی شریک بھائی سے یہ سب کہلوا کر اپنے آپ کو کشمکش سے آزاد کرلیا تھا۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

واہمہ

سورج مغرب کی سمت کھائی میں اُترتا جاتا ویسے ویسے بستی کے لوگوں کے ذہنوں میں خوف کے چراغ لو دینے لگتے۔ گروہ میں رہتے ہوئے ہر فرد ایک دوسرے سے جدا ہو جاتا۔

اپنے ذہنوں میں پکنے والے لاوے میں اپنے آپ جلنے لگتا۔ کوئی نیا چہرہ سامنے آتا تو یوں دیکھنے لگتا جیسے یہی وہ نامعلوم دشمن ہے۔ جس کے آنے کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔

بستی میں یہ روز کا تماشہ تھا۔ نامعلوم کہاں سے باتیں پھیلتیں، عورتیں چولھوں میں جلنے والی چٹختی لکڑیوں سے آوازیں سنتیں یا مرد دیواروں کے ان دیکھے کانوں کی سائیں سائیں سے نتیجہ اخذ کرتے۔ شام ہوتے ہوتے بستی کی ساری رونق سورج کے ساتھ مغرب کی کھائی میں کھو جاتی۔ ماحول میں عجیب سی سرگرشیاں، چہ میگویاں اور سرسراہٹیں ہوتیں۔ پورا ماحول طلسماتی ہو کر رہ جاتا۔ کانا پھوسی سنائی دیتی۔ ''آج وہ آنے والے ہیں۔ جنوب کی سمت سے۔ کل بھی آئے تھے۔ کالے گھوڑوں پر سوار کالے جبے پہنے ہوئے۔ اُن کے سینوں پر شیر کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ چہرے پر کالا نقاب تھا۔ آنکھ کی جگہ سوراخ تھے۔ اندھیرا اُنھیں نگل جاتا تھا۔ وہ سب کو دیکھ سکتے۔ اُنھیں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ آج وہ بستی بھسم کرنے والے ہیں۔ کالی آندھی کی طرح ٹوٹ پڑنے والے ہیں۔''

ساتھ ساتھ تسلی کی باتیں پھیل جاتیں۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مشرق کی سمت سے اُن کا مقابلہ کرنے کیلئے سفید گھوڑوں پر سوار ہرے جبے پہنے ہوئے گھوڑ سوار آجائیں گے۔ تم اطمینان سے سو جاؤ۔ تمہاری حفاظت کا بندوبست ہو چکا ہے۔ اللہ مددگار ہے۔ کل تو وہ نہیں آئے۔ راستہ بھٹک گئے تھے لیکن آج ضرور آئیں گے اور مقابلہ کرنے والے بھی آئیں گے۔ اللہ رب العزت کی بڑی مہربانی ہے۔ اُس نے خود ہی اپنے بندوں کی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔''

کالے جبے والے کالے گھوڑ سوار کب آتے تھے اور کب جاتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اُن سے مقابلہ کرنے والے ہرے جبے والے سفید گھوڑ سوار کس سمت سے آتے تھے اور کس سمت جاتے یہ بھی

www.taemeernews.com

کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن ساری بستی کے لوگ ان دونوں گھوڑ سواروں کے آنے کا انتظار ایسے کرتے تھے جیسے کسان بارش کا کرتا ہے۔ روز سرِ شام عورتوں اور بچوں کو بستی کے مدرسے اور اُس کے احاطے میں پہنچا دیا جاتا تھا دس بیس کڑیل نوجوان مدرسے کے گیٹ پر رات بھر سنگی مجسمے کی طرح کھڑے رہ کر پہرہ دیتے۔ رات خاموشی سے کھسک جاتی۔ مغرب کی کھائی میں گرا ہوا سورج مشرق کی سمت سے سر اُبھارتا تو لوگوں کے چہرے پہلی کرن کے ساتھ کھل اُٹھتے۔ اُن کے ذہنوں میں ٹمٹماتے خوف کے چراغ پہلی کرن کے ساتھ بجھ جاتے۔ وہ ایک دن اور جی اُٹھنے کی خوشی میں مست ہو جاتے۔ اُن کے چہروں پر مسرت جھلمل کرتی۔ بستی میں زندگی کی ہلچل شروع ہو جاتی۔ بازاروں میں رونق لوٹ آتی۔ بچے بالے چیخ پکار کرتے شور مچاتے۔ عورتیں ایک دوسری سے رات کو بغیر مرد کے سونے کی تکالیف بیان کرتیں یا پھر اپنی اپنی پڑوسنوں کی غیبت اس رغبت سے کرتیں جیسے تمام واقعات جو وہ بیان کر رہی ہیں اُن کی چشم دید، واحد گواہ ہوں۔

اس فتنے نے بستی کو اپنی لپیٹ میں اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ پیچھا چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس طوالت سے اُکتا کر چند سیانوں نے سوچا کہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس کا کچھ تدارک کریں کہ روز صبح جی اُٹھنے اور سرِ شام مر جانے کے اس عمل سے اُن کا پیچھا چھوٹے سو یہ سیانے سر جوڑ کر بیٹھے اور غور کیا کہ وہ کونسا ریڈیو ہے جو افواہ کو اپنی سڑی کوکھ سے جنم دیتا ہے۔ وہ کون سی بے کان دیوار ہے جو انسانوں کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہے لیکن اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کو الزام دیں۔ کس کو مجرم گردانیں۔ اس سوچ بچار اور پرفتنہ ماحول میں کئی دن بیت گئے۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ جی اُٹھنے اور سورج کے مرتے ہی سرِ شام مر جانے کا عمل جاری رہا۔

ایک دن پھر افواہ کی آندھی بڑی تیز اُٹھی۔ چاہے آگ برسے چاہے پانی آج تو وہ ہو کر رہے گا جو کبھی نہیں ہوا۔ ''۔۔۔کالی آندھی خوشحالی کو مٹانے کے لئے ضرور آئے گی۔۔۔'' آج دوپہر سے ذرا پہلے جب محلے کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو نڈھال سے لوگ مسجد کی جانب دوڑ پڑے۔ مسجد اور مسجد کا صحن جلد ہی پر ہو گیا۔ لوگوں نے بڑی یکسوئی سے نمازیں ادا کیں۔ امام صاحب نے نماز کے اختتام پر گڑگڑا کر دُعائیں مانگیں کہ اللہ عالم الغیب اس غیبی فتنے سے ہمیں بچائے۔ دُعا کے بعد ہشاش بشاش چہرے باہر نکلے لیکن کچھ ہی دیر بعد اُن کے چہروں سے اللہ کے عالم الغیب ہونے کے ایمان کی روشنی غائب ہونے لگی وہ پھر افواہوں کے اسیر ہونے لگے۔ وہی روز کا نامعلوم خوف اُن کے ذہنوں میں در آنے لگا۔

www.taemeernews.com

شام سے ذرا پہلے تک ایسی ہوا چلی کہ محسوس ہوتا تھا بستی کا ہر آدمی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو چکا ہے۔ وزیرا بشیرے کو آواز دیتا تو بشیرا خوف کے مارے جواب نہیں دیتا کہ معلوم نہیں یہ آواز وزیرا کی ہے یا اُس کالی آندھی کے کالے گھوڑ سوار کی۔ عورتیں اپنے بچوں کو یوں سمیٹتیں جیسے مرغی اپنے بچوں کو اپنے پروں میں سمیٹتی ہے اور نا معلوم ان دیکھے دشمن سے مقابلے کے لئے گردن اکڑائے آنکھ اور کان کھلے رکھ کر بیٹھتی ہے۔ بچے ان فتنوں سے دور مچلتے بلبلاتے، بار بار باہر بھاگتے اُنھیں سمیٹ سمیٹ کر مائیں جب تنگ آجاتیں تو اُن کی پٹائی کر دیتیں۔ بچوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ سرِ شام ہی اُنھوں دبوچ کر گھر کے ایک گوشے میں یوں بٹھا دیا جاتا جیسے گدے اور تکیوں کو رکھ دیا جاتا تھا۔ پھر اُنھیں کچی نیندوں میں اُٹھا اُٹھا کر قریب کے مدرسے میں ماؤں، بہنوں کے ساتھ پہنچا دیا جاتا۔ کچھ بچے صبح اُٹھنے کے بعد مزے لے لے کر رات کا قصہ سناتے۔ ''ابّو معلوم ہے آج کیا ہوا۔ جادو ہو گیا جادو۔ میں گھر میں سویا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو مدرسے کے ننگے فرش پر پڑا ہوا تھا''۔ دوسرا کہتا۔ ''میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ میں اور میری چھوٹی بہن سوتے گھر میں لیکن آنکھ کھلتی مدرسے میں۔ روز روز ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ نا معلوم کونسی پریاں ہم کو وہاں لے جاتی ہیں۔ وہ چاند میں رہنے والی پریاں تو زمین پر نہیں آگئیں، جن کو ہم نظم میں پڑھتے ہیں۔'' پھر وہ زور زور سے قہقہے لگا کر ہنستے۔ بچوں کے لئے یہ ایک تفریح تھی لیکن اُن کے بڑوں کے لئے یہ جان جوکھم کا زمانہ تھا۔

آج بھی روز کا معمول بستی میں در آیا تھا۔ اُدھر سورج کی آنکھ بند ہوئی اِدھر خوف کے چراغ ذہنوں میں ٹمٹمانے لگے۔ آج جلدی جلدی عورتوں اور بچوں کو مدرسے میں پہنچا دیا گیا۔ کچھ نڈر لوگ ہاتھوں میں بھالے، لاٹھیاں اور گنڈاسے لے کر مسلسل یوں گشت کرتے جیسے وہ فوجی ہوں اور اس بستی کی حفاظت کرنا اُن کا فرض ہو۔ کہیں پتہ بھی کھڑکتا تھا تو ان کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ نا معلوم اندیکھے دشمن سے مقابلے کے لئے ایستادہ ہو جاتے۔

لیکن روز کی طرح آج بھی رات کا سارا زہر کاجل کی طرح آنکھوں میں گھول لینے کے بعد بھی وہی دھاک کے تین پات، کچھ بھی نہ ہوا۔

بستی کے سیانے آج پھر جمع ہوئے۔ آج وہ کوئی حتمی فیصلہ کر کے اُٹھنا چاہتے تھے کیونکہ اس روز روز کے مرنے اور جینے کے مصنوعی ماحول سے مردوں کے چہروں پر پژمردگی چھا رہی تھی۔ عورتوں کے پستان ڈھلکاؤ کی جانب مائل تھے۔ مردوں کی ہمتیں پست تر ہوتی جا رہی تھیں اور عورتوں کی کوکھ بنجر۔ زندگی میں مایوسی نے گھر کر لیا تھا۔

www.taemeernews.com

جب سارے پنچ اور سیانے جمع ہو گئے تو رمضو نائی نے کہا۔ ''چودھری جی اس بلا کا راستہ کاٹو نہیں تو بستی میں بھیانک پستی آئے گی۔۔۔۔'' چودھری نعیم کہ جس نے آدھی صدی کے موسموں میں زندگی کے دن گذارے تھے لیکن یہ ماحول اُس کے لئے بالکل انوکھا تھا۔ وہ مسکرایا اور بولا۔ ''بھئی کوئی ہو تو اُس کا راستہ بھی کاٹا جائے۔ یہاں تو غیبی شئے ہے۔'' جان محمد گویا ہوا۔ ''اگر یہ فتنہ جلدی ختم نہ ہوا تو بستی کے لوگ کسی اور بستی کی طرف ہجرت کر جائیں گے۔'' تمام لوگ جان محمد کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ اُس بیچارے کو کیا معلوم اس برصغیر میں ہر خطہ زمین پر ایسا ہی پر اسرار، اشرار سے بھرا ماحول سرسراتے پھرتا ہے۔ حاجی اللہ بخش نے تشویش ظاہر کی۔ ''لوگوں کا ایمان کمزور ہو رہا ہے وہ اللہ کو عالم الغیب نا مان کر افواہ کے اسیر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ شرک کی دلیل ہے۔ اس شر سے معصوم لوگوں کو بچانا ہمارا فرض اولین ہے۔''

الغرض اس قسم کی باتوں میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ فتنہ جوں کا توں کھڑا رہا۔ لوگ سوچ ہی نہیں پا رہے تھے کہ کیا کیا جائے۔ اُن کی سوچیں جیسے بانجھ ہو گئی تھیں۔ پھر بھی وہ سر جوڑ کر بیٹھتے تھے۔ مختلف اٹکلیں لڑاتے تھے۔ چودھری نعیم نے کہا۔ ''ہم ایسا کیوں نہ کریں بستی والوں کو مشورہ دیں کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں اپنی اپنی بیویوں اور بچوں کے درمیان گھوڑے بیچ کر سو جائیں۔ ہم اس کالی آندھی سے خود نبرد آزما ہونگے۔ تم پر تمہاری بیوی بچوں پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔''

بشیرا نائی جھٹ بول پڑا۔ ''لوگ باگ کیسے یقین کریں گے چودھری جی آپ کی باتوں پر؟'' رحیم بھشتی بولا۔ ''چودھری جی ٹھیک ہی کہات ہین۔ ایسن ماحول ماسب پیچ رام بھروسے چھوڑن دی جات ہے۔ بس اللہ کا نموالیو ہور مہرارو کی بگل میں دبک کے سوئی جاؤ۔۔۔'' یوسف قصائی نے رحیم بھشتی کی مشک پر جیسے چھری چلائی۔ ''میں کہوگا اتے سارے لوگ ہے کس کام کے۔ ایک اپھوا کا مکابلہ نہیں کر سکتے ہے۔'' یوسف قصائی ایسے جوش میں تھا جیسے کسی جانور کا چمڑا ادھیڑ رہا ہو۔

سب گنگ بیٹھے تھے۔ سورج کے مرنے میں ابھی چند ساعت باقی تھیں۔ سب لوگ بستی کے تمام لوگوں کو یکجا کرنے کے بارے میں ایک دوسرے کو کہنا کہ نہیں کہنا کہ مخمصے میں مبتلا تھے کہ اُس لمحہ رحیم بھشتی کا گیارہ سالہ لڑکا بھاگم بھاگ بے دم ہوتا آیا اور دھپ سے ان سیانوں کے بیچ بیٹھ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بے دم دوڑنے کی وجہ سے اُس کا دم پھول گیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ چودھری نعیم نے اُسے اپنے پاس بلایا۔ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر بعد جب بچے کی سانسیں درست ہوئیں تو پوچھا۔ ''بیٹا کیا کہنا چاہتے ہو کہو۔'' بچے نے چاروں طرف یوں دیکھا

www.taemeernews.com

جیسے کوئی اُس کا مخالف تو یہاں نہیں بیٹھا ہے۔ رحیم بھشتی بھی اپنے بچے کے پاس کھسک آیا تھا۔ اُس نے بھی اُس کا حوصلہ بڑھانے کیلئے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اور کہا۔ ''ہاں بیٹا کا بات ہے کہو سب اپنے ہی لوگ بیٹھن ہین۔''

بچے نے کہا۔ ''بابا مدرسے کے بازو میں جو گھر ہے نا جس میں شاہ جی رہتے ہیں نا وہی روز روز نئی نئی باتیں پھیلاتے ہیں۔ ابھی وہ مدرسے کے کونے پر کھڑے ہو کر بھولا موی سے کہہ رہے تھے آج ذرا جلدی پھیلا دینا کہ آج تو وہ لوگ ہر حال میں آنے والے ہیں۔ موی نے بھی ہاں ہاں کی تھی۔ پھر شاہ جی بولے۔ شام کو چراغی لینے آجانا۔ جب سے ہم یہ فتنہ پھیلا رہے ہیں۔ چڑھاوا چڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بد عقیدہ عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تعویز گنڈے لینے کے لیے اُمنڈ پڑتی ہے۔ پیسوں کی جیسے بارش ہو رہی ہے اور ایک ماہ تک یہ سیزن چل پڑا تو ہم ضرور بلڈنگ کے مالک بن جائیں گے۔۔۔۔'' رحیم بھشتی نے ڈانٹ کر بچے کو چپ کرایا اور غصے سے کہا۔ ''ابے تو کا کا سمجھات ہے۔ اُو شاہ جی بڑا گیانی منئی ہین تو کا کچھو کر دیئن تو کا ہو یئے۔''

چودھری نعیم نے رحیم کی پیٹھ تھپتھپاتے کہا۔ ''گھبراؤ مت رحیم بھائی! ہم سب آپ کے ساتھ ہیں اور اب دیکھو تماشہ اُس افواہ کے ریڈیو کا۔'' چودھری جو کہ سردار بھی تھا اور آدھی صدی کے موسموں کو دیکھا تھا۔ محلے کے پنچوں کے ساتھ بھولا موی کے گھر پہنچا اور تفصیل معلوم کی اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ شاہ جی ہی افواہ کی نشرگاہ ہیں۔ پنچوں سے چند منٹوں تک مشورہ کیا اور پولس کو خبر کر دی کہ سرکاری ریڈیو کی موجودگی میں یہاں خانگی ریڈیو کا کیا کام۔

پولس نے شاہ جی کو اس وقت اپنی تحویل میں لے لیا جب وہ اُلٹے ہاتھ سے ایک مرید کو تعویز دے رہے تھے اور دوسرے سیدھے ہاتھ سے دس کا نوٹ لے کر جیب میں ٹھونس رہے تھے۔ چند ہی منٹوں میں جنگل کی آگ کی طرح افواہ پھیل گئی کہ افواہ کو قید کر لیا گیا ہے۔ یک روزہ فسادات کے بعد ہفتوں تک بستی والوں نے جو عذاب جھیلا تھا وہ بہت سنگین تھا۔ ہر کسی کا چہرہ پژمردہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں تھیں۔ آج جب اُنھیں معلوم ہوا کہ وہ فتنہ جس نے اُن کی زندگی کو کانٹوں میں جھونک دیا تھا آج ختم ہو گیا ہے تو آج عرصے بعد بستی کے لوگ اپنی بیویوں سے لپٹ کر گھوڑے بیچ کر سوئے۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

ایک سوچ

اتوار کے دن یوں ہی جی کسمسانے لگتا ہے۔ روز کی طرح جھٹ بستر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم ایسے ہی بستر میں گھسے کسلمندی دور کرنے کی کوشش کررہے تھے کی بیگم نے آندھی طوفان کی طرح ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ جب سوالیہ نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھا تو بڑی ادا سے بولیں۔ ''میں جارہی ہوں بھائی جان کے یہاں آپ گھر سنبھالئے۔'' ہم نے کہا۔ ''بے فکر جایئے۔ چیل کے گھونسلے میں مانس کہاں کہ کوئی لے جائے۔'' ہم نے پھر آنکھیں موندلیں۔ ہمیں یاد آیا آج بھلے ہی چھٹی کا دن ہے لیکن ۱۵ر گست بھی تو ہے۔ ہم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ جلدی جلدی تیار ہوکر آفس کے احاطے میں پہنچ گئے جہاں بس باس ڈوری کھینچ ہی رہے تھے۔ اگر ہم سلامی میں شریک نہیں ہوتے تو دوسرے دن صاحب کا میمونیبل پر ہمیں سلامی دینے کیلئے تیار رہتا۔

آزادی کی خوشی میں سرشاری سے لہراتے جھنڈے کو سلامی دے کر ہم جب گھر لوٹے تو گھر بالکل خالی خالی، تنہا تنہا سا لگا۔ ہم خالی الذہن ہوکر بیٹھے ہی تھے کہ ہمارے ذہن میں تانڈو ناچ شروع ہوگیا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ خالی گھر جن کا مسکن اور خالی سر شیطان کا مکان۔ میاں شیطان ہمارے سر کو خالی دیکھ کر در آئے تھے۔ ہمارا سران کا دیکھا بھالا تھا۔ جب ہم آزاد تھے۔ بیگم کے کھونٹے سے بندھے نہیں تھے۔ اس وقت یہ حضرت ہماری کھوپڑی میں براجمان ہوکر ہمیں تگنی کا ناچ نچایا کرتے تھے۔ پہلے تو مئے ہمارے منہ میں ٹپکاتے تھے۔ پھر اِدھر اُدھر مٹکاتے تھے۔ گلی گلی بھٹکاتے تھے۔ ہماری آنکھیں کہیں نا کہیں اٹکاتے تھے۔ اس ٹپکانے، مٹکانے، بھٹکانے اور اٹکانے میں ہم کہیں نا کہیں اٹک ہی جاتے تھے۔ ان دنوں جوانی کا خمار، کچھ نا کچھ منچلا پن کرنے کا بخار ذہن میں کسی اژدھے کی طرح پھنکارتا تھا۔ پھر میاں شیطان کا بہکاؤ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

ہم نے خالی الذہنی سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔ سوچنے لگے کہ وقت کی پل صراط پر سے کیسے گذرا جائے۔ چند لمحوں کی سوچ کے بعد خیال آیا کہ پرانے دوستوں سے مل لیا جائے۔ کچھ لوگوں کی

www.taemeernews.com

چھان پھٹک کر لی جائے۔ تا کہ صبح شام کی خلیج پٹ جائے۔ خالی خولی بیٹھے شیطان جی کو موقع مل جائے گا کہ وہ ہمارے ذہن پر غاصبانہ قبضہ نہ جمائے رکھیں۔

ذہن میں آیا کہ جلیل احمد سے ملے بہت دن ہو گئے چلو ان سے ملتے ہیں اپنے یار ہیں۔ میاں شیطان کہیں آس پاس ہی منڈلا رہے ہوں گے۔ کھٹ سے ذہن میں در آئے جبکہ ان کے در آنے کی گنجائش قطعی نہیں تھی۔ میاں شیطان جونیئر جارج بش جی کے خاندان سے معلوم ہوتے ہیں یا جارج بش شیطان جی کے۔ کہیں بھی کسی بھی پھٹے میں ٹانگ اڑا ہی دیتے ہیں۔ انہوں نے ذہن میں کانا پھوسی کی۔ ''ہاں! ہاں! پرانے یار کے ساتھ ساتھ پرانی یارنی کملی سے مل لو۔ پتہ نہیں بیچاری کس حال میں ہو۔''

یہ بڑی بری بات ہو رہی تھی یہ جناب پھر سے ہم کو گھیرنے کے چکر میں تھے جب تک ہم گھر کو جنوں کے حوالے کر کے ٹہلیں گے تب تک یہ حضرت بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ہمارے ذہن کو آزاد نہیں ہونے دیں گے۔

ہم تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ ہمیں سلیم لکڑ ہارا مل گیا۔ اس کے ایک کندھے پر کلہاڑی تھی اور ایک کندھے پر رسی کا گچھا تھا۔ اس نے ہمیں سلام کیا۔ ہم نے جواب دے کر پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟'' ''لکڑی کاٹنے اور کہاں؟ روجی روٹی کرونگا نہیں تو چار پانچ جنوں کا پیٹ کیسے بھرونگا؟''

ہم نے پوچھا۔ ''تمہیں معلوم ہے آج یومِ آزادی ہے؟''

''یادِم آجادی۔'' سلیم نے حیرت سے دہرایا لیکن یومِ آزادی کا تیہ پانچ کر دیا۔ ''ہاں بھئی! آج ہمارا ہندوستان گوروں کی غلامی سے آزاد ہوا تھا۔'' سلیم نے بڑے بوڑھوں کی طرح کہا۔ ''آجادی۔ گلامی مجھے نہیں معلوم۔ میں بہت چھوٹا تھا تب میرا باپ لکڑی کاٹتا تھا۔ کھانستا تھا۔ کھانستے جاتا تھا۔ پھر لکڑی کاٹتا تھا۔ یہ دونوں کام کرتے کرتے وہ مر گیا۔ یہ رسی اور کلہاڑی میرے ہاتھ میں دے گیا۔ بس اپنی جندگی یہی ہے۔ آجادی، بجادی کا چکر مجھے نئی معلوم۔'' اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

ہم بھی آگے بڑھ کر جلیل احمد کے کارخانے پہنچ گئے۔

جلیل احمد یہاں آیا تھا تب بڑا معصوم گبرو جوان تھا۔ گول مٹول چہرا، چمکتی آنکھیں، ہنس مکھ، وہ جیب کو زیب، جیل ذیل کہتا تھا۔ ہم کئی دوست اسے گھیر کر بیٹھتے تھے۔ اس سے باتیں کرتے تھے۔ خوب مزا لیتے تھے۔ عبدالرحیم انصاری بڑا مذاقیہ تھا۔ وہ جلیل احمد کو خوب چھیڑتا تھا۔ جلیل احمد چڑتا جاتا تھا اور باتیں کرتا جاتا تھا۔

ہم جب جلیل احمد کے خارخانے میں پہنچے تو وہ پاورلوم پر سزائے بامشقت کی طرح جتا ہوا تھا۔

www.taemeernews.com

ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ ابھری جیسی کسی اپنے کو دیکھ کر مریض کے چہرے پر اُبھرتی ہے۔ مجروح، مجروح، گھٹی، گھٹی، جلیل احمد نے ہمیں دیکھ کر کان میں اڑسی ہوئی تارپون، لوم پر رکھی اور باہر نکل آیا۔

ہمیں اس بات پر حیرت تھی کہ یوم آزادی پر بڑی آزادی سے روزمرہ کے کاموں کو انجام دیا جارہا تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مست۔ کبھی کوئی طالب علم سہ رنگی جھنڈی ہاتھ میں لئے گذرتا تو سب حیرت سے دیکھنے لگتے لیکن کوئی نہیں سوچتا کہ آج طالب علم کے ہاتھ میں بستے کی جگہ سہ رنگی جھنڈی کیوں ہے؟ ہمیں محسوس ہوا کہ ہم نے کرنسی نوٹ پر فوٹو چھاپ کر، آفس کے کیبن میں گاندھی جی کے مجسمے کو قید کرلیا ہے۔ رہے نہرو جی جو اپنی زندگی میں پارہ صفت رہے تو اُنھیں چاچا کہہ کر بزرگ بنادیا ہے۔ ہم یہ سب اَلم غلم سوچ رہے تھے کہ جلیل احمد کی صدا گونجی۔ ''اسلام وعلیکم'' ہم نے جواب دیا تو محسوس ہوا کہ جلیل احمد کی صدا نے ہمارے ذہن کی الم غلم سوچ کو بھگادیا ہے۔ ہم دونوں لب سڑک چائے کے کھوکھے کے سامنے بچھے پٹرے پر بیٹھ گئے۔ یہ کھوکھا کسی ہوٹل کی پیروڈی کی طرح تھا۔ ہمارے شہر میں یا ہندوستان کے کسی بھی شہر کے شہریوں میں چند عادتیں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں کسی محلے میں شادی ہوتی ہے تو تنگ گلی میں منڈپ لگتا ہے۔ دونوں جانب گٹر ہوتی ہے لیکن ہم بڑے مزے سے گٹر کے کنارے بیٹھ کر دعوت اُڑاتے ہیں۔ اگر ایسا نا کھائیں تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم نے کسی تقریب میں دعوت اُڑائی ہے۔ مزہ ہی نہیں آتا۔ اسی طرح کھوکھے کے سامنے لب سڑک چائے نہیں پی جاتی اور یہ بھی ضروری ہے کہ آتی جاتی گاڑیوں کی دھول اڑتی رہے اور اس کا کچھ حصہ چائے کے گلاس یا پیالے میں شامل نا ہوجائے تب تک اچھا ہی نہیں لگتا۔ جب ہفتہ بھر کولھو کے بیل کی طرح پسینے میں شرابور محنت کرنے والا مزدور چھٹی کے دن وہ بھی جمعہ کے دن تھیٹر پر جاکر سو پچاس روپئے میں بلیک سے سنیما کا ٹکٹ نا خریدے اسے فلم گھر میں کڑھتے بیٹھنے والی اپنی گھر والی کی طرح بوڑھی بوڑھی لگتی ہے۔ جب ہم ایک کارخانے کے پڑوس میں رہتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جس طرح ہمارا دل سینے میں دھڑکتا ہے اسی طرح گھر کا بھی دل گھر میں دھڑکتا ہے۔ پہلے تو اس منحس سا لگتا تھا۔ بعد میں حالت یہ ہوگئی کہ کسی وجہ سے کارخانہ بند ہوجاتا تھا تو محسوس ہوتا تھا ہمارے دل کی دھڑکن رک گئی ہے۔ ہم سوئے رہتے تھے تو خاموشی کے سناٹے سے آنکھ کھل جاتی تھی اور ہم سونے کیلئے کارخانے کی دھڑکن کا انتظار کرتے تھے۔ ہفتے میں ایک دن کارخانوں کی چھٹی ہوتی تو محسوس ہوتا تھا کہ آج شہر کا دل خاموش ہوگیا۔ گلی کوچوں میں شاہراہوں پر سناٹا بول اُٹھتا تھا۔

www.taemeernews.com

جلیل احمد نے بیئر کو چائے لانے کیلئے آواز دی۔ بیئر ایک ہاتھ میں پانی کا مگ اس میں گلے تک ڈوبا گلاس، دوسرے ہاتھ میں دو کانچ کے گلاس میں چائے لے آیا۔ جب وہ چائے کے گلاس کو تھوڑا تیڑھا کرتا تو خون دل میں ڈبو لی انگلیاں میں نے کے مانند اس کی میل سے کٹ انگلیوں کے پور چائے چکھ لیتے تھے۔ کبھی کبھی یہ انگلیاں خون دل میں ڈوبنے کی طرح پائے جگ میں بھی غوطہ زن ہو جاتی تھیں لیکن اس پٹرے پر ماسٹر، لیکچرار، ڈاکٹر، وکیل، سیٹھ اور مزدور محمود و ایاز کی طرح وقت گذاری کرتے اور مزے مزے سے چائے نوش فرماتے۔ گھنٹوں کاروبار میں مندی محبوبہ کی بے وفائی، گھریلو جھگڑوں، کھری کھوٹی کمائی یا پھر مقامی سیاست کی الف بے جانے بغیر عالمی سیاست پر بات کرتے تو عراق اور فلسطین ضرور زیر بحث آتے۔ وہ اپنی دانست میں بل کلنٹن اور آئی۔ کے۔ گجرال سے کم کی باتیں نہیں کرتے تھے۔

جلیل احمد سے ہم نے کہا۔" معلوم ہے آج کونسا دن ہے؟"

"کونسا دن؟" جلیل احمد نے حیرت سے پوچھا۔

آج یوم آزادی ہے اور تم کارخانے میں قید ہو۔" جلیل احمد کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ہوا کے جھونکے کی طرح آئی اور غائب ہو گئی۔ اس نے کہا۔" یوم آجادی تو ہم اس دن سے کہیں گم کر آئے جس دن اس کارکھانے میں کید ہوئے۔ اب یوم آجادی سے ہمیں کیا مطلب۔" جلیل احمد کو بولنا بہت پسند ہے۔ دوستوں میں وہ بہت بولتا تھا۔ دوست دور دور ہو گئے تو اس نے ان پڑھ کے نام سے شاعری شروع کر دی تھی۔ کبھی کبھی اچھا شعر بھی موزوں کر لیا کرتا تھا۔ ایک دو مشاعروں میں ہم نے اسے سنا۔ شعر کا خیال اچھا تھا لوگوں نے چلا چلا کر داد دی لیکن اسٹیج پر بیٹھے جغادری لوگوں نے محسوس کر لیا تھا کہ شعر کا وزن پاورلوم پر خوبصورت نقش نگار بنانے والی لیفس کی طرح نیچے اوپر ہے۔

جلیل احمد نے تقریر شروع کر دی۔ بولے۔" جب ہم ملوک سے یہاں آئے تھے تو سوچا تھا کچھ دن تک کھوب محنت کریں گے۔ ڈھیر سارا روپیہ جمع کریں گے۔ پھر اپنے گاؤں جا کر دو بیل، ایک کھٹارا خریدیں گے۔ اپنے کھیت میں ایک کنواں کھودوائیں گے۔ کھیت میں ہل چلائیں گے۔ گوڑیں گے۔ فصل بوئیں گے۔ کاٹیں گے۔ پھر سادی کریں گے لیکن ہوا کیا؟"

ہم نے لقمہ لگایا۔" کہانی بالکل شیخ چلی جیسی ہو گئی۔ پھر کیا ہوا جلیل احمد؟" ہم اسے جلیل احمد کہتے تھے تو وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ جلیل احمد نے اپنی میلی میلی کمزور ہوتی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور کہا۔ "اب تو ہماری کبر یہاں بنے گی۔ بڑے سونا پورا۔ پہلے ایک لوم چلاتے تھے گذر بسر ہو جاتی تھی۔ پھر دو

www.taemeernews.com

دو ہوئے۔ اب چار اور چھ پاور لوم چلاتے ہیں تب کہیں گھر کی گاڑی چلتی ہے۔ اگر کم پگار ملی تو بدھ یا جمعرات کو ہی ڈبے کھڑکھڑانے اور مہرارو بڑبڑانے لگتی ہے۔'' ہم دونوں ہنسنے لگے۔

جلیل احمد نے میرے لئے سگریٹ منگانے کیلئے پنچر کو آواز دی۔ ''اے پنچر ایک وِلس سرگیٹ لانا۔'' اب ہماری اور جلیل احمد کی عمر ایسی نہیں تھی کہ ہم اسے کچھ سکھا پڑھا سکتے تھے۔ اگر ہم کچھ سکھاتے بھی یعنی کہتے کہ سرگیٹ نہیں سگریٹ کہو تو وہ ہمیں غصیلی نظروں سے دیکھتا۔

اس نے بیڑی جلائی اور ہمارا سرگیٹ بھی داغ دیا۔ بیڑی کے ایک دو کش لینے کے بعد بولا۔ ''ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ سال دو سال میں ایک دو روپیہ مجوری بڑھتی ہے تو مجور کا لوم بڑھ جاتا ہے کیونکہ کپڑے کے تاکھے کی لمبائی دس میٹر بڑھ جاتی ہے۔ تاکھا لمبا ہو جاتا ہے۔ مجور بے چارہ بے حال کو نو پرسان حال نہیں؟''

دو بڑے بیٹھے جس طرح عالمی سیاست پر بات کرتے ہیں اسی طرح ہم نے بڑا عالمی اور علمی جواب دیا۔ ''جلیل احمد! یہ سب سیٹھوں کی چال اور لیڈر لوگ کا کمال ہوتا ہے۔ ان کی سوچ ہے کہ جب تک مجور بے حال نہیں رہے گا۔ مال یعنی کپڑا تیار نہیں ہوگا تو سیٹھ کے پاس مال یعنی روپیہ کہاں سے آئے گا؟ پھر سیٹھ لیڈر کو کرسی تک پہنچنے کیلئے روپیہ کہاں سے لگائے گا۔ اس لئے تیری بھی چپ میری بھی چپ۔ یہ ہے سیٹھ اور لیڈر کا کمال۔ یہ ہے گہری چال جسے مجور سمجھ نہیں رہا ہے۔ جس دن سمجھ لے گا اسی دن اسی طرح انقلاب زندہ آباد کا نعرہ لگائے گا۔ جس طرح سعادت حسن منٹو کے پیٹ میں وہسکی جا کر انقلاب زندہ آباد کا نعرہ لگاتی تھی۔''

ہم نے بڑے مدبرانہ انداز سے جلیل احمد کی جانب دیکھا۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''ایں کون بزرگ کا پانی ہے جون پیٹ ماجا کر نعرہ لگاوت ہے؟'' پھر ہنستے ہوئے کہا۔ ''اے تو پھر دیر کیوں لگا رہے ہو پلا دو سب مجورن کے سالی کے۔ سب انکلاب جندہ آباد کرتے پھریں گے۔'' ہم نے مولویانہ انداز میں ہاتھ کانوں کی لوؤں تک لے جا کر کہا۔ ''توبہ! توبہ! اگر حرام چیز سب مجورن کو پلا دیں گے تو شہر میں وہ طوفان بدتمیزی آجائے گا کہ توبہ بھلی! بھائی خاص لوگ ہوتے ہیں جو اسے پچا لے جاتے ہیں۔ ہمارے تمہارے جیسا عام سا آدمی تو پچا ہی نہیں سکتا۔ بڑبڑاہٹ میں، لڑکھڑاہٹ میں یا پھر جھگڑے میں اگل ہی دیتا ہے۔ اسے پچانے اور روپیہ بچانے کا بوتا ہم تم میں تھوڑ دنا ہے۔'' بات کچھ کچھ جلیل احمد کی سمجھ میں آگئی تھی۔ بہت دیر بعد اس نے ہماری خیریت کی جانب دھیان پھیرا اور بولا۔ ''کہو کیسے ہو؟ پورے دو سال بعد ملے ہو۔ ہم نے دو بچے بڑھا لیے اور دو لوم بھی۔ اب بچوں کا آنکڑا سات ہو گیا ہے۔ تمہارے

www.taemeernews.com

کتنے بچے ہیں؟'' سوال داغ دیا۔

ہم نے کہا۔ ''ہم دو ہمارے دو۔'' جلیل احمد نے جلدی اور زور سے کہا۔ ''بس بس آگے مت بڑھنا ورنہ ہماری طرح پچھتاؤ گے۔ ویسے تم ہو سرکار کے جوائنیں۔ دن جاؤ پیسہ آؤ۔ کام نا دھام۔ آم ہی آم۔'' پھر وہ گنگنانے لگا.....

ملک کو لوٹ لیا سرکار والوں نے کرسی والوں نے

ہمیں تو لوٹ لیا لوم والوں نے کارکھانہ داروں نے

جلیل احمد کا شکوہ بہت ہی صحیح تھا۔ جب بہت پہلے پاور لوم پر کام کرنے والے کو ایک یا دو لوم کی مزدوری سوا دیڑھ سو مل جاتی تھی۔ جمعہ کے دن پگار لے کر وہ خوش خوش گھر آتا تھا۔ ہفتہ بھر خرچ کرنے کے بعد بھی کچھ پس انداز ہو جاتا تھا۔ سرکاری ملازم کو اس وقت مہنہ بھر بعد ستر پچھتر روپیہ ملتا تھا..... لیکن آج سرکاری ملازم آٹھ دس ہزار گن رہا ہے اور مزدور تین کے اندر ہی دم توڑ رہا ہے وہ بھی محنت بڑھا کر اتنی بڑی کھائی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جلیل احمد، عبدالرحیم انصاری، محمد غوث، بدرو اور موتی لال ملنے سے کتراتے ہیں۔ کچھ دوست میری پہنچ سے دور بھی پہنچ گئے ہیں۔ بڑی بڑی بلڈنگوں کے احاطے میں مقید ہو گئے ہیں۔ جن تک میں پہنچ سکتا ہوں ان تک برابر پہنچ جاتا ہوں لیکن واپسی بنا کوفت لیے نہیں ہوتی۔ ایک انجانی سی کڑھن ہوتی ہے۔ کس کی غلطی؟ مزدوروں کی یا سماج کی، حکومت کی؟ اس کا علاج سوجھ نہیں رہا ہے۔ اگر آپ کے پاس.....'' ذہن بوجھل ہو جاتا ہے۔ سوچوں، وسوسوں اور اندیشوں کو نیند بھگا دیتی ہے۔ چند لمحوں بعد ہی دنیا سے میرا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

بشیرا

بشیرا خوبصورت عربی نسل کا گھوڑا تھا لیکن وہ ہمارے خاندان کا بہت معتبر اور معزز رکن ہونے کا اعزاز پا چکا تھا۔ اُس کی آنکھیں بڑی پر تاثیر اور چمکدار تھیں۔ اُس کے کان ہمیشہ کھڑے رہتے اور منہ سے مہین آواز بھی سن لیتے۔ اُس کے ماتھے پر ہلکا سا گول کالا نشان ایسا تھا جیسے مائیں اپنے خوبصورت بچے کو کاجل کا ٹیکہ اس لئے لگاتی ہیں کہ اُن کے لال کو کسی کی نظر نا لگ جائے۔ اُس کے ماتھے پر کا یہ ٹیکہ اُس کے چہرے کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتا تھا۔ ماتھے کے اس کالے ٹیکے کے علاوہ کھر سے لے کر دُم تک اور گردن کی ایال تک کیا مجال کہ ایک بھی کالا بال یا ذرا سا کالا چھینٹا دکھائی دیتا ہو۔ سفید براق، چمکتے بال، روئی کے گالے میں بھی کہیں کہیں پودے کے پتے یا مٹی کا کالا ٹکڑا مل جاتا ہے لیکن بشیرا کا بدن بڑا پاک صاف تھا۔ چاند میں داغ دکھائی دیتا ہے جسے ہم چرخہ کاتتی ہوئی بڑھیا کا نام دیتے ہیں لیکن بشیرا بڑھیا کے بالوں کی طرح تھا۔ اُس کی دیکھ بھال کرنے والے ملازم تک اُسے ہاتھ لگانے کیلئے ڈرتے تھے کہ ہاتھ کا میل اُس کے سفید سفید بال پر کوئی داغ نا ڈال دے۔ ویسے بھی بشیرا کا چہرا اتنا رعب دار تھا کہ اجنبی آدمی اور خاندان کے باہر کے بچے تک اُس کے قریب پھٹکنے سے ڈرتے تھے۔ بشیرا خود بھی بڑا پاک صاف رہتا تھا وہ دوسرے گھوڑوں کی طرح نرم مٹی یا ریت دیکھ کر لوٹتا نہیں تھا۔ اُسے بہت کم بیٹھتے دیکھا گیا۔

دادای اماں بتاتی ہیں کہ جب اُسے خرید کر لایا گیا تھا وہ بالکل ہماری طرح بچہ تھا۔ اُسے دوسرے جانوروں کے ساتھ باندھا گیا تو اُس نے ہنہنانا شروع کیا۔ خوب اُچھل کود مچائی۔ سب لوگ پریشان ہو گئے دادی اماں نے ہی صلاح دی کہ اُسے دوسری جگہ باندھا جائے۔ جب اُسے ایک صاف ستھری کوٹھری میں باندھا گیا تو وہ مطمئن ہوا۔ بشیرا نے اپنی کوٹھری میں کبھی لید نہیں کی اور نا ہی پیشاب کیا۔ رات میں جب اُسے اندر لے جایا جاتا تو وہ پہلے پیشاب کرتا پھر لید کرتا۔ صبح تڑکے جب اُسے باہر لایا جاتا تو کوٹھڑی صاف ستھری رہتی ملازم اُسے باہر لے جاتا وہاں وہ پیشاب اور لید کرتا۔

بشیرا کی دُم بہت لمبی تھی۔ وہ مچھر یا مکھی کی بھنبھناہٹ سنتا تو فوراً اپنی دُم سے مور چھل کا کام لیتا۔ بدن کے چاروں طرف پھیراتا اور گردن ہلاتا تو کانوں سے پٹ پٹ کی آواز نکلتی۔ مچھر مکھی بھاگ

www.taemeernews.com

جاتے۔ وہ اتنا صاف ستھرا رہتا کہ مکھیاں اُس کی طرف کبھی کبھار ہی رُخ کرتیں لیکن میاں مچھر خون پینے کیلئے اکثر منڈلاتے کیونکہ وہ بہت تندرست اور توانا تھا۔

بشیرا ہم سے زیادہ لاڈلا تھا کیونکہ اُس کی دیکھ بھال کیلئے دو ملازم ہر وقت مستعد رہتے تھے۔ وہ اُسے روز ندی پر لے جا کر گہرے پانی میں تیراتے پھر اُتھلے پانی میں کھڑا کر کے اُس کی جلد کو دھو کر خوب چمکاتے۔ وہ کسی نواب زادے کی طرح بڑی شان سے کھڑا ہوتا۔ جب ملازم اُسے کنارے پر لاتے۔ دھوپ میں کھڑا کرتے تو وہ اپنے بدن کو اس طرح ہلاتا کہ اُس کے چاروں طرف بارش کے پہلے پانی کی پھواری اُڑنے لگتی۔ پھر ملازم اُس کے بدن کو سہلا سہلا کر بچا کھچا پانی نچوڑتے۔ پھر صاف ستھرے کپڑے سے ایسے پونچھتے جیسے اماں نہلا کر تولیے سے ہمیں پونچھتی تھیں۔ گھر آنے کے بعد اُس کے بدن پر کھرارا (برش ایلومینم یا لوہے کا) کرتے۔ اُس کا بدن اور چمچمانے لگتا۔ پھر نواب زادے کے منہ پر چنے بھرا توبڑا لگا دیا جاتا۔ تب وہ کٹر کٹر چنے چباتا۔ چنے کھانے کے بعد ہری ہری گھاس جھٹک کر ڈالی جاتی۔ دادی اماں کا کہنا تھا کہ جانوروں کو گھاس جھٹک کر کھلانی چاہئے کیونکہ گھاس میں کیڑے چھپے ہوتے ہیں۔ جانور گھاس کے ساتھ کیڑے کھالیتا ہے تو بیمار ہو جاتا ہے۔ اس لیے خاص طور پر بشیرا کو کھلائی جانے والی گھاس خوب جھٹکی جاتی اور اطمینان کر لیا جاتا کہ اب ایک بھی کیڑا نہیں ہوگا۔ تب ہی بشیرا کو پیش کی جاتی۔ میاں بشیرا بھی بڑے عقل مند تھے۔ جب وہ گھاس کے نوالے کو منہ میں لیتے تو خود بھی جھٹک پھٹک کر منہ میں ڈالتے۔ ملازم اُس سے پوچھتے سرکار اور چنے کھاؤ گے یا گھاس کھاؤ گے۔ جب اُسے کھانا ہوتا تو وہ اپنی گردن کو نیچے اوپر ہلاتا یعنی اور کھائے گا۔ جب نہیں کھانا ہوتا تو اپنی گردن کو دائیں بائیں انکاری انداز میں ہلاتا۔

کبھی کبھار ابا اُس کی خیریت دریافت کرتے تو بڑے دلار سے پوچھتے۔ ''کیوں بشیر میاں! خیریت ہے نا۔ اگر اُس کے ساتھ کوئی ناانصافی یا زیادتی ہوئی ہوتی تو وہ پیر پٹخ کر اظہار کرتا۔ ناانصافی نہیں ہوئی ہوتی تو وہ نا میں گردن ہلاتا اور ہونٹ پھاڑ پھاڑ کر مسکراتا۔ اُس کے مسکرانے پر ابا پیار سے پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے۔ ناانصافی کے اظہار پر ملازموں کو بلا کر اُس کے سامنے ڈانٹتے اور ہلکے سے چابک رسید کرتے تو وہ بہت خوش ہوتا۔ ہونٹ پھاڑ پھاڑ کر گردن ہلا کر خوشی کا اظہار کرتا۔

ابا جب کبھی دورے پر جاتے یا کھیتوں کا پھیرا لینے جاتے تو اُسے خوب سجایا جاتا۔ پیروں میں گھنگرو باندھے جاتے۔ گلے میں نقرئی گھنٹیوں کی مالا پہنائی جاتی۔ سر پر تاج کے بیچوں بیچ قوسِ قزح کے رنگوں میں رنگائے، پرندوں کے پروں سے بنایا گیا طرّا کھڑا کر دیا جاتا۔ زین بھی بڑی چاؤ بھری ہوتی۔

www.taemeernews.com

پیٹھ پر پہلے دبیز مخمل کا کپڑا ڈالا جاتا۔ اُس پر ایک نرم گدا ڈالا جاتا۔ یہ گدا خاص طور سے اس مقصد سے بنایا گیا تھا۔ اُس کے بعد زین رکھی جاتی۔ زین کے دونوں طرف دو گول گول تکیے ہوتے۔ زین بالکل سائیکل کے سیٹ کی طرح بیچ میں خالی ہوتی۔ تسموں پر بھی دبیز مخمل چڑھا ہوتا کہ تسموں سے اُس کا بدن چھل نا جائے۔ اُس کے بعد لگام لگائی جاتی۔ لگام پر چاندی کے تاروں سے کام کیا ہوا ہوتا اور منہ میں دبا جانے والا دھات کا حصہ بھی چاندی کا ہوتا۔

سج دھج کے ساتھ ہی پانی کی مشکیں، چنے کی تھیلی اور توبڑا بھی ساتھ ہوتے کیونکہ نواب زادے کسی دوسری جگہ کا پانی نہیں پیتے اور نہ کسی کی ڈالی ہوئی گھاس کھاتے۔ کوئی لاکھ کھلانا پلانا چاہے لیکن وہ نفرت سے نگاہ پھیر لیتا۔ جب ابا کھانے کے وقت پر منہ پر چنے کا توبڑا لٹکاتے تو بڑے مزے سے کھاتا۔

جب ابا واپس آتے تو گھر سے دوری پر ہی بشیرا زور زور سے ہنہناتا، جیسے اپنی آمد کا سائرن دے رہا ہو کہ سواری پہنچ رہی ہے۔ ہوشیار ہو جاؤ۔ اُس کی آواز سن کر ملازِم دوڑ کر صحن کے نیچے آ کر انتظار کرتے۔ جیسے ہی وہ اپنی مخصوص جگہ پر آ کر کھڑا ہوتا ایک ملازِم لگام پکڑتا۔ دوسرا سامان ہٹا کر زین کھولتا۔ زین اُتاری جاتی تو پیٹھ کے جتنے حصے پر مخمل اور گدا ہوتا اُتنی جگہ پسینے سے تر ہو جاتی۔ ملازِموں کو ہدایت تھی کہ اُسے اُس وقت تک چلایا جاتا جب تک پیٹھ سوکھ نا جائے۔ پھر پانی پلایا جاتا۔ پانی پلانے کے بعد چنے سے بھرا توبڑا منہ پر لٹکا دیا جاتا۔ پھر بدن پر کھرارا کیا جاتا۔ بشیرا پر صرف گھر کے ہی افراد سواری کر سکتے تھے۔ ملازِم جو کہ رات دن اُس کی خدمت کرتے تھے اُن کی کیا مجال کہ وہ اُس پر سواری کر لیں۔ وہ کوشش تو ضرور کرتے لیکن بشیرا اپنے بدن کو پتہ نہیں کیسے جھٹکا دیتا کہ سوار دھپ سے زمین پر گر جاتا۔ ملازِم ڈبل سزا پاتے۔ ایک تو گرتے دوسرے جب گھر آتے تو وہ پیر پٹخ پٹخ کر غصے کا اظہار کرتا۔ ابا سمجھ جاتے کہ ملازِموں نے کچھ گڑبڑ کی ہے۔ ابا ملازِموں کو اُس کے سامنے ڈانٹتے تو اُس کا غصہ ٹھنڈا ہوتا اور وہ ہونٹ پھاڑ پھاڑ کر ایسے مسکراتا جیسے اُس کی باچھیں کھل اُٹھتی ہوں۔

دادی اماں بتاتی تھیں کہ بشیرا ملازِموں سے زیادہ عقل مند تھا۔ ایک بار چچا مجھے اپنے ساتھ بیٹھا کر کھیت کی طرف گئے۔ جب واپس ہوئے تو گھر سے تھوڑی دوری پر وہ اُتر کر کسی آدمی سے بات کرنے لگے۔ پھر بشیرا کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''جاؤ گھر'' میں بیٹھا ہی رہا۔ بشیرا بہت آہستہ آہستہ یوں چلنے لگا کہ میں ہلوں تک نہیں۔ گھر کے قریب پہنچ کر اُس نے اپنی مخصوص اطلاع دی۔ وہ اپنی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اونٹ کی طرح اونچا تھا۔ اُس کی پتلی پتلی مضبوط ٹانگیں تھیں۔ ملازِموں کے ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ

www.taemeernews.com

رہے تھے۔ وہ بڑی آہستگی سے بیٹھ گیا تا کہ ملازم مجھے اُتار لیں۔ جب وہ کبھی بیمار ہتا تو ہم بچے اُس کا سر سہلاتے اور خاص طور پر اُس کے ماتھے پر کے کالے گول گول ٹیکے کو ہاتھ لگانا چاہتے۔ ہم سمجھتے تھے کہ کاجل کے ٹیکے کی طرح یہ بھی کاجل کا ٹیکہ ہے۔ ہم اُسے پیار بھی کرتے۔ جب ہم زیادہ تنگ کرتے تو وہ کھڑا ہو کر ہماری پہنچ سے دور ہو جاتا۔ ہم کوشش کرتے کہ وہ دوبارہ بیٹھ جائے لیکن وہ ہمیں گھاس نہیں ڈالتا۔

دادی اماں نے ایک واقعہ بتایا کہ گوری چمڑی والوں کا راج پاٹ تھا۔ وہ ہمیں ستانے کے نئے نئے قانون بناتے تھے۔ ایک بار اُنہوں نے قانون بنایا کہ کسان اپنی فصل صرف اپنے ضلع میں بیچ سکتے ہیں۔ اِسے اُنہوں نے ضلع بندی کا نام دیا۔ کئی جگہ بازار دوسرے ضلع میں تھے۔ ہمارے گاؤں کی فصلوں کا بازار بھی دوسرے ضلع میں تھا۔ لانے والی چیزوں کا بازار بھی دوسری جگہ تھا۔ ایسے وقت میں بشیرا بہت کام آتا۔ چچا خود اپنا مال دوسرے گھوڑوں پر لاد کر بہت سارے بیوپاریوں، کسانوں کے قافلے کے ساتھ آگے آگے چلتے۔ بشیرا خطرے کی بو سونگھ کر کھڑا ہو جاتا۔ پھر وہ راستہ تبدیل کر لیتا۔ گوری چمڑی والوں کے چوکی داروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قافلے کو بہ حفاظت منزل تک پہنچا کر واپس بھی لے آتا۔ اُس کی اِس خوبی کا سارا گاؤں معترف تھا۔

ایک بار کوئی بڑا صاحب گاؤں میں آیا۔ سیر کے لئے گھوڑا طلب کیا تو کسی نے خچر نما گھوڑا لا کر دیا۔ صاحب نے ناک بھوں چڑھایا تو کسی نے ہمارے گھوڑے کے بارے میں بتایا۔ صاحب نے اپنا کارندہ بھیجا۔ ابا نے گھوڑا نہیں دیا تو صاحب خود آیا۔ ابا نے لاکھ سمجھایا لیکن وہ صاحب بضد ہوا کہ سیر اسی گھوڑے پر کروں گا۔ ابا نے ملازموں کو زین لگانے کیلئے کہا۔ جب صاحب رکاب میں ایک پیر ڈال کر دوسرا پیر دوسری طرف ڈال رہا تھا اُسی وقت پتہ نہیں بشیرا نے کون سی پچھاڑ ماری کہ صاحب چاروں شانے چت گرے۔ ملازم اور ہم بچے ہنسنے لگے تو ابا نے ڈانٹا۔ صاحب نے اُٹھ کر کپڑے جھاڑے اور دوبارہ کوشش کی تو انجام وہی ہوا۔ تب ایک ملازم نے بتایا کہ صاحب یہ عجیب جناور ہے۔ خاندان کے علاوہ اس پر کوئی سواری نہیں کر سکتا۔ صاحب ہم لوگوں کی تفریح کا سامان بن گیا تھا۔ بہت شرمندہ ہوا لیکن ابا پر جرمانہ لگا دیا۔ ابا بھی بشیرا جیسے گھوڑے کے مالک تھے۔ اُنہوں نے تفتیش کیلئے اوپر عرضی کر دی۔ تفتیش کیلئے بڑے صاحب آئے تو چھوٹے صاحب ایک ہی رٹ لگا رہے تھے کہ اُن کے پاس عربی نسل کا گھوڑا ہے۔ تفتیش کرنے والے صاحب بہت چراغ پا ہوئے اور اُس افسر کا تبادلہ کر دیا۔

گاؤں میں جب میلے یا جترا کا موسم ہوتا۔ رام نومی، کرشن لیلا یا محرم کا تہوار تو بشیرا کو بڑے بھیا

www.taemeernews.com

خوب نچاتے۔ اُس کا ناچ دیکھنے گاؤں دیہات کے علاوہ شہر کے بھی لوگ آتے۔ جب گھوڑ دوڑ کا مقابلہ ہوتا تو دوسرے گھوڑ سواروں کے پاس چابک یا ڈنڈے ہوتے لیکن بڑے بھیا چچا بغیر چابک کے ہی ہوتے اور جیت بشیرا کے حصے میں ہی آتی۔ ملازموں اور گھر کے کسی بھی مرد کو اُسے تھپڑ مارنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اُس وقت ریموٹ یا دوسری چیز تو تھی نہیں کہ اُس سے بشیرا کو اشارہ ملتا لیکن وہ از خود اشارہ سمجھ لیتا کہ سوار کیا چاہتا ہے۔ لوگ اُس کی چال اور دوڑ دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کبھی کبھی ملازم اُسے نہلانے لے جاتے تو میں بھی ساتھ جانے کی ضد کرتا۔ ملازم ابا سے اجازت لے کر مجھے اُس کی پیٹھ پر بٹھانے کی کوشش کرتے لیکن ناکام رہتے۔ تب بشیرا نیچے بیٹھ جاتا۔ جب وہ گہرے پانی میں تیرتا تو میں اُس کی پیٹھ پر بیٹھا رہتا۔ اُس کی گردن پر جھالر کی طرح جھلتی ایال کو مضبوطی سے پکڑ لیتا۔ اُتھلے پانی میں آکر وہ بیٹھ جاتا۔ مطلب یہ ہوتا کہ میں پیٹھ پر سے اُتر جاؤں۔ ملازم اپنا کام ختم کر کے کنارے آتے اور اُسے سکھا دیتے تو وہ پھر بیٹھ جاتا۔ مطلب یہ ہوتا کہ میں سوار ہو جاؤں۔ اُس کے نیچے بیٹھنے پر پیٹ اور ٹانگوں پر ریت چپک جاتی تو پتہ نہیں وہ اپنی چمڑی کو کیسے حرکت دیتا کہ ریت کا ذرہ ذرہ جھٹک جاتا۔

جب مجھے دوسرے شہر پڑھنے کیلئے بھیجا گیا تو میں نے بشیرا کی گردن سے لپٹ کر خوب آنسو بہائے۔ بشیرا نے میرے گالوں کو اپنی کھردری زبان سے بڑی صفائی سے چاٹا۔ میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں سے بھی موٹے موٹے آنسو بوند بوند ٹپکنے لگے۔ جب میں برس بعد گھر آیا تو معلوم ہوا کہ بشیرا پاگل ہو گیا تھا۔ اس لئے چچا نے روتے ہوئے اُسے گولی ماردی تھی۔ کیونکہ اس کے علاوہ اُس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ •••

www.taemeernews.com

یادوں کے بھنور

ابھی سورج نکلا ہی تھا کے طاہرہ کی آواز آئی۔

''اُٹھئے! باہر آپ کے کوئی رشتے دار انتظار فرما رہے ہیں۔ میں آپ کے ان بن بلائے مہمانوں سے تنگ آ چکی ہوں۔ گھر نہیں ہوا، گیسٹ ہاؤس ہوا۔ آئے دن وقت بے وقت کوئی نا کوئی ٹپک ہی پڑتا ہے۔''

اُس کی یہ شکایت بجا تھی۔ ہمارے یہاں مہمانوں کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ دور نزدیک کے گاؤں، دیہات کے رشتے دار شہر آتے تو ہمارے گھر کا پھیرا ضرور لگاتے تھے۔ میں نے باہر جھانکا۔ گیٹ پر چوکی دار اسٹول پر بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے ایک آدمی کھڑا تھا۔ اُس کے سر پر رومال لپٹا ہوا تھا۔ کپڑے بھی میلے کچیلے تھے۔ بال بھی بے ترتیب اور داڑھی بھی غیر تراشیدہ تھی۔ مجھے اُسے پہچاننے میں دُشواری ہو رہی تھی۔ جب طاہرہ مجھے جگا رہی تھی تو میں سمجھا کے شہر میں کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے جس کی اطلاع دینے کیلئے کوئی آیا ہے لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو اُس آدمی کی شکل کچھ کچھ جانی پہچانی معلوم ہونے لگی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور غور کرنے لگا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ مجھے شدید اُلجھن ہو رہی تھی۔ میں کون ہے، کون ہے میں اُلجھ گیا تھا۔ میں نے چوکیدار کو فون پر اطلاع دی کہ اُس شخص کو اندر بھیج دے۔

جیسے جیسے وہ آدمی قریب آ رہا تھا ویسے ویسے اُس کی پہچان کھل رہی تھی۔ مجھے یاد آیا اور میں چونک اُٹھا۔ ارے یہ تو شیدا ہے۔ میرے بچپن کا دوست۔ اسکول کا ساتھی۔

وہ باہر آ کر بینچ پر بیٹھ گیا اور میں کچھ دیر کے لئے ماضی میں کھو گیا۔

ہم دونوں گاؤں کی اسکول میں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ ساتھ ہی شرارتیں کرتے تھے۔ ہماری دھما چوکڑی میں گاؤں کے اور بھی لڑکے شامل ہو جاتے تھے۔ گاؤں کی اسکول میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں شہر چلا آیا۔ جب کبھی چھٹیوں میں گاؤں جاتا تو ساتھیوں سے ملاقات ہوتی۔ خوب باتیں ہوتیں۔ اب

www.taemeernews.com

ہماری باتوں میں کبھی کبھار لڑکیوں کا بھی ذکر ہوتا۔ شہر کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے دوسرے بڑے شہر میں آ گیا۔ دوسرے بڑے شہر میں آنے کے بعد میرا رابطہ گاؤں سے اور ساتھیوں سے ٹوٹ گیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے سرکاری نوکری کیلئے کوشش کی اور میرا تقرر ڈپٹی کلکٹر کے لئے ہوگیا۔ اس کے بعد تو گاؤں سے تعلق ہی ختم ہوگیا لیکن شیدا کو دیکھ کر میں گاؤں پہنچ گیا تھا۔ جہاں شیدا کی آنکھ شنو سے لڑ گئی تھی اور وہ شنو پر دل و جان سے فدا تھا۔ گاؤں کے واقعات میرے سامنے فلم کی طرح آنے لگے۔

گاؤں کے لوگ سورج نکلنے سے پہلے جاگ پڑتے تھے۔ عبادت، پوجا پاٹ کے بعد اپنے اپنے کھیتوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں اپنے سروں پر دو دو تین تین پیتل کے چمچماتے ہنڈے کلسیاں لے کر ندی کی طرف چل پڑتیں۔ جب سورج کی شعاعیں ان برتنوں پر پڑتیں تو بجلی سی کوند اُٹھتی۔ طاہرہ کی آواز آئی۔ ''کہاں کھو گئے جناب۔ بیٹھے بیٹھے سو رہے ہو یا اپنے آپ کھو رہے ہو۔ میں تمہاری اس کھو جانے والی عادت سے تنگ آ گئی ہوں۔ جاؤ مہمان کے پاس بیٹھو۔ ڈرائنگ روم کے بازو والا کمرہ کھولو۔ بیچارے کے منہ ہاتھ دھلاؤ۔'' میں ماضی سے واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور اُٹھ کر ڈرائنگ روم کھلوا کر باہر چلا گیا تو دیکھا شیدا اونگھ رہا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سُن کر وہ کھڑا ہوگیا۔ وہ مرعوب اور سہما سہما سا لگ رہا تھا۔ وہ بے تکلفی جو بچپن میں ہم دونوں میں تھی معلوم نہیں کہاں چھوڑ آیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ شیدا بچپن کی طرح ملے، بات کرے۔ وہ بچپن میں بہت ہی شرارتی تھا۔ جب لڑکیاں اور عورتیں تین تین ہنڈے سروں پر رکھے ہاتھ چھوڑے چلتیں تو وہ راستے کے بازو میں اُگی ہوئی اونچی اونچی فصل میں چھپ کر غلیل سے پتھر مارتا پھر یہ دیکھے بغیر برتن گرے یا نہیں چوپائے کی طرح فصل میں غائب ہو جاتا۔ اُس کا نشانہ بڑا پکا تھا۔ میں شیدا کے پاس بیٹھ گیا اور پوچھا۔''

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''پتہ نہیں کہاں کہاں سے آیا ہوں۔ صدیاں بیت گئیں چلتے چلتے۔''

اُس نے بڑا گہرا جواب دیا تھا۔ میں سمجھا وہ اپنی پرانی شرارت پر آ گیا ہے لیکن اُس کے چہرے اور آنکھوں میں جو وحشت اُمنڈ آئی تھی اُسے دیکھ کر میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مجھے کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر رُک کر اُس نے کہا۔ ''اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا کہ اچانک تمہاری یاد آ گئی۔ سوچا ہمارا دوست بالے بڑا صاحب ہوگیا ہے۔ چلو دیکھیں۔'' اس کے سوکھے ہونٹوں پر لمحہ بھر کو ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

www.taemeernews.com

میں نے لمبا سانس لے کر کہا۔ ''بڑا صاحب تو ہو گیا ہوں لیکن مجھے گاؤں اور تم لوگ ابھی تک یاد ہیں۔ بچپن کی یادیں امر بیل کی طرح ہوتی ہیں سدا امر رہتی ہیں۔ سناؤ کیسے ہو تم، گاؤں کے سب لوگ کیسے ہیں؟''

شیدا نے نظریں نیچے رکھے رکھے کہا۔ ''مجھے تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ گاؤں کے لوگ بھی ٹھیک ہیں۔ چودھری اور سرپنچ موہن گرو جی کب کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دونوں کی موت کے بعد گاؤں میں وہ بات نہیں رہی جو پہلے تھی۔ گاؤں سے دس کوس دور ندی کا پانی روک کر ڈیم بنا دیا گیا ہے۔ گاؤں میں ٹانکی بن گئی ہیں۔ نل آ گئے ہیں۔ اب پگڈنڈی عورتوں اور لڑکیوں کے پیروں کو ترستی ہے۔ ایک تھیٹر بھی آ گیا ہے۔ پان، بیڑی کی دکان لگ گئی ہے۔ ایک ہوٹل بھی کھل گیا ہے۔ چوپال سونی ہو گئی ہے۔ اب بیج کی، فصل کی، ڈھور ڈنگروں کی باتیں نہیں ہوتیں۔ قرض کی، فلم کی، ہائی برِیڈ اور کیڑے مار دوائیوں کی باتیں ہوتی ہے۔'' اب شیدا کھل رہا تھا۔ اُس کی جھجک دور ہو رہی تھی۔

''میں نے پوچھا۔ شبو کا کیا حال ہے؟''

میرے سوال پر اُس کی آنکھیں معمول سے بڑی ہونے لگیں اور چہرہ بھی رنگ بدلنے لگا۔ اُس نے متغیر چہرہ میری طرف کر کے کہا۔ ''راکھ سے چنگاری نکال رہے ہو۔ اُس بے وفا کا نام مت لو۔ وہ بے وفا نکلی۔ جی مجھ سے لگایا اور تن کسی اور کو سونپ دیا۔ بھاگ گئی سالی، اُس بنئے کے ساتھ جو اُسے اپنی دوکان سے گُڑ چھولے چرا کر کھلایا کرتا تھا۔'' میں نے محسوس کیا کہ اب اُس کی آنکھوں میں وحشت پوری طرح در آئی ہے۔ اور ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا ہے۔ میں نے موضوع تبدیل کرنے کیلئے جلدی سے کہا۔ گاؤں میں میل ملاپ تو ویسا ہی ہوگا جیسا پہلے تھا؟''

شیدا کا چہرہ اب معمول پر آ گیا تھا۔ اُس نے کہا۔

''نہیں بھائی! اب وہ بات کہاں؟ چودھری اور موہن گرو جی کے بعد دوری آ گئی ہے۔ اب سب اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ جن کو کوئی کام نہیں ہوتا وہ سیاست میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ موہن گرو جی کا لڑکا تو بڑا بدمعاش نکلا۔ اس طرح چودھری کا لونڈا بھی۔ دونوں نے ایک ایک پارٹی کی چودھراہٹ سنبھال لی ہے۔ کبھی کبھی گاؤں میں دہشت پھیلا دیتے ہیں۔ کچھ بڑے بوڑھے ہیں جن کے نام سے گاؤں میں امن شانتی باقی ہے۔''

وہ رُکا تو میں نے پھر پوچھا۔ ''بھولا موسی کا کیا حال ہے؟''

وہ بھی سدھار گئی۔ اُس کی پوتی (لڑکی) نے خوب گل کھلائے کہ گاؤں کے آدھے لونڈے

www.taemeernews.com

اُس کے فراق میں آہیں بھرنے لگے تھے۔ ایک دن وہ سب کو جل دے کر ممبئی چلی گئی اور سنا ہے وہاں دھندہ کر کے خوب پیسے کما لئے۔ کیا کرتی بیچاری اکیلی تھی سب اُسے مفت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مُنڈے (جہیز کی رقم) کے بغیر کوئی شادی کرنے راضی نہیں تھا۔ اپنا عبدل تھا نا وہ بھی اُس پر لٹو ہو گیا تھا۔ شادی کی بات بھی پکی کر لی تھی لیکن اُس کا باپ کٹھ ملا تھا۔ کہتا تھا پہلے کلمہ پڑھا پھر سادی رچائے۔ عبدل تو اُسے لے کر بھاگنے والا تھا لیکن موہن گروجی کے لونڈے نے ہلڑ مچادی۔ گاؤں میں دنگا فساد ہو جاتا۔ شانتی نے خود موہن گروجی کے لونڈے کا گریبان بھری چوک میں پکڑ کر پٹائی کر دی۔ خوب گالیاں دیں اور کہا میرا تو کوئی نہیں تو ہی شادی کر لے۔ مگر تو چاہتا ہے کہ پکے آم کی طرح تیری گود میں گر جاؤں اور تو چوس کر پھینک دے۔ بڑے دل گردے کی بات تھی۔ اُس رات وہ چلی گئی۔ موہن گروجی کا لونڈا نیت خراب کر بیٹھا تھا۔ اغوا کرنا چاہتا تھا لیکن عبدل بڑا جگر والا تھا۔ رات بھر تلوار لئے شانتی کے گھر کی نگرانی کرتا رہا اور پو پھٹے دس کوس دور بس اڈے پر چھوڑ آیا۔ اب تو گاؤں میں تکون بن گئی ہے۔ ایک طرف چکر ہے۔ ایک طرف شیر ہے تو ایک طرف اپنا چرخہ ہے گاندھی باپو کی یادگار لیکن کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ بس بے جان تصویروں کو دیکھا کرو۔ پانچ سال بعد نیتا لوگ آتے ہیں۔ بھاشن دے کر راشن کم کر کے چلے جاتے ہیں۔'' ہم دونوں ہنسنے لگے۔

میں نے کہا۔ گولی ماروان سب کو تم بتاؤ بال بچے کیسے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہے۔ گاؤں میں سوکھا پڑا ہے۔ بارش روٹھ گئی ہے۔ ندی سوکھ گئی ہے۔ سارا گاؤں پریشان ہے۔ زمینوں کی طرف نگاہ اُٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ بانجھ عورت کی طرح بنجر زمین بھی اپنا حسن کھو دیتی ہے۔ میں نے سوچا اب گاؤں سے نکل کر کچھ کرنا چاہئے۔ اس لئے تمہیں کھوجتا چلا آیا۔'' میں نے محسوس کیا اُس کی آنکھوں میں نمی آ گئی ہے اور چہرہ اُتر گیا ہے۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ خیر اب تم اُٹھو ہاتھ منہ دھولو۔ ناشتہ کرو پھر باتیں ہوں گی۔ میں نے اُسے باتھ روم بتایا تو وہ اندر جانے کیلئے ڈرنے لگا۔ میں نے کہا بھئی یہ مہمانوں کا کمرہ ہے اور باتھ روم بھی مہمانوں کا ہے۔

اندر سے طاہرہ کی کھٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی۔ میں ناشتے اور شیدا کے انتظار میں بیٹھا پھر گاؤں لوٹ گیا۔ ناگ پنچمی، ہولی، دیوالی، دسہرہ، رام لیلا، عید، بقرعید، محرم اور عرس، میرے چچا نانک میں کبھی رادھا بنتے تو کبھی سیتا کا روپ دھارتے، بھجن گاتے، میلاد خوانی کرتے۔ گاؤں کے ہندو مسلمان مل کر شیرنی کھاتے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔ خوشیوں کی گنگا بہتی۔ پھر میں آج میں الجھ گیا۔ شیدا کے بتانے کے مطابق اب وہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ زمانہ تہذیبوں اور رواتوں

www.taemeernews.com

کے زوال کا زمانہ ہے۔شہروں میں تو حال اور بھی برا ہے۔کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہے۔

جو اونچے میناروں پر پہنچا اُس نے نیچے والوں سے نگاہیں پھیر لیں۔سب کچھ اپنے لئے سمیٹ لیا۔سچ بات تو یہ ہے کہ اوپر پہنچنے کے بعد انسان بھی اوپر والے کو رینگتے کیڑے نظر آتے ہیں۔بھلا کیڑے مکوڑوں کی کوئی اہمیت ہے؟ میں نے مزید بہک جاتا کہ شیدا باتھ روم سے نکلا وہ میلے انگوچھے سے ہاتھ منہ پوچھتا رہا تھا۔میں نے گھنٹی بجائی اندر سے نوکرانی آئی۔میں نے کہا۔ناشتہ لگاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد ہم کھانا کھا رہے تھے۔شیدا پہلی بار اتنے سجے سجائے کمرے میں ٹیبل کرسی پر کھانا کھا رہا تھا۔ہمارا گاؤں شہروں سے بہت دور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔وہاں بدیسی ہوائیں بمشکل ہی آتی ہیں۔اس لئے برائیاں وہاں دیر سے پہنچتیں تھیں۔ہم دونوں خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔لیکن میرا ذہن پھر یادوں کے جگنو پکڑ رہا تھا۔ابا،اماں اور چچا شدت سے یاد آرہے تھے۔چہارم تک تو گاؤں میں اسکول تھی۔چہارم کے بعد تحصیل کے قصبے میں پڑھنے جاتا۔نوکر گھوڑے پر بیٹھا کر لے جاتا اور شام کو واپس لاتا۔ساتویں تک تحصیل کے قصبے میں پڑھنے کے بعد پھر شہر آنا پڑا۔کیونکہ تحصیل میں بھی ساتویں تک ہی اسکول تھا۔ساتویں کے امتحان میں اول آیا تو سارے گاؤں نے خوشیاں منائی تھیں۔شہر آنے کے بعد گاؤں سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔سال میں دو دفعہ گاؤں جاتا تو دوستوں کی محفل جمتی۔شیدا،موہن لال،اقبال سنگھ،جنگلو،پیڑو اور عبدل سب دوست ملک کر خوب گپیں مارتے۔شرارتوں کے ساتھ ساتھ بات چیت میں اب لڑکیاں بھی شامل ہوگئی تھیں۔شیدا شغو پر جان دیتا تھا۔جب وہ سر پر ٹوکرا رکھے کھیت کی طرف جانے کے لیے نکلتی تو شیدا بھی پیچھے پیچھے جاتا۔کسی کھیت میں دونوں بیٹھے باتیں کرتے پھر اپنی اپنی راہ لیتے۔اُنہیں دنوں پڑوس کے گاؤں کا رحیم بنیا ہمارے گاؤں آیا اور پرچون کی دکان کھول دی۔اُس کا لونڈا بڑا منچلا تھا۔اُس کی نگاہیں تبو پر جم گئی۔گڑ چھولے کھلا کھلا کر اُس نے تبو کو رجھالیا۔ایک دن گاؤں میں افواہ پھیل گئی کہ رحیم کا لونڈا تبو کو لے اُڑا۔شیدا کچھ مہینوں تک چپ چپ سا رہا۔پھر معلوم ہوا کہ پڑوس کے گاؤں کی نور جہاں جو ہمارے ساتھ پڑھتی تھی اُس سے شیدا کی شادی ہوگئی۔نور جہاں کا چہرہ بڑا پرنور تھا۔ہرنی سی آنکھیں لیکن بڑی سنجیدہ تھی میں کوشش کرتا تھا کہ وہ میرے پاس بیٹھے۔اُس کی آنکھوں میں مجھے بجلیاں کوندتی دکھائی دیتی تھیں۔میں نے شیدا سے پوچھا۔نور جہاں کیسی ہے؟ تم بڑے قسمت والے ہو کہ تمہیں نور جہاں جیسی حسین وجمیل بیوی ملی۔" وہ چپ رہا۔میں ٹک ٹک اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔اُس کا چہرہ پھر بدل رہا تھا۔آنکھوں میں سُرخی دوڑنے لگی تھی اور ماتھے پر شکنجوں کا جال تن رہا تھا۔کھاتے کھاتے ہاتھ روک لیا تھا۔چند لمحوں بعد اُس نے کربناک لہجے میں کہا۔دراصل نور جہاں سے

www.taemeernews.com

جمی نہیں۔ میرا سب کچھ وہ رنڈی شبو چھین لے گئی تھی۔ چند دنوں بعد ہی نور جہاں چلی گئی۔ میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ایک بار کبڈی کھیلنے پڑوس کے گاؤں گیا تھا۔ وہاں تبو دکھائی دی۔ میں نے اُسے مار ڈالا۔ پھر مجھے جیل ہوگئی۔ جیل سے پچھلے برس چھوٹا بھٹکتا رہا۔ پھر گاؤں گیا تو ایسا لگا گاؤں والوں کے لئے اجنبی ہوں۔ بڑے دکھ بھرے دن رات کاٹے۔ رات رات بھر بھٹکتا تھا۔ موہن گروجی کے لونڈے نے رپورٹ کردی گاؤں میں پاگل گھس آیا ہے۔ پولس پکڑ لے گئی۔ تحصیل کے جج نے چھوڑ دیا۔ تب سے گاؤں نہیں گیا۔ اِدھر چلا آیا۔"

میں شروع سے محسوس کر رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ شیدا کبھی کبھی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کو کہاں کھپاؤں کہ وہ اُٹھا اور بغیر ہاتھ دھوئے ہی باہر نکل گیا۔ میں گم سم بیٹھا رہا تب چوکا جب باہر گاڑی کی آواز آئی آفس کا وقت ہوگیا تھا۔ دن بھر میں گاؤں میں اُلجھا رہا۔ یادوں کے جگنو پکڑتا چھوڑتا رہا۔ شیدا، شبو، نور جہاں میں اُلجھا رہا۔ شام ہوتے ہوتے شیدا آکر جاتا یادوں کے ذخیرے میں ایک افسانہ بن چکا تھا۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

غنی نواز

غنی نواز مر گیا۔

اس میں حیرت زدہ ہونے کی بات ہی نہیں تھی۔ انسان یا جاندار پیدا ہی مرنے کے لئے ہوتا ہے لیکن پتہ نہیں مجھے غنی نواز کے مرنے کا افسوس کیوں ہوا؟

غنی نواز کی موت پر کوئی بھیڑ اکٹھی نہیں ہوئی۔ کہیں چرچا ہوا نہ ہی تعزیتی جلسہ۔ کیوں ہوتا؟ وہ تھا ہی اس زمین پر کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگنے والے کروڑوں انسانوں میں سے ایک۔ دنیا کے غلط طریقہ کار کا ایک معمولی کل پرزہ، جس کے ہونے نا ہونے سے دنیا کے نظام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اچھا ہوا جو کل کا آج ہو گیا۔ آخر ہم سب کو بھی تو آج کل مرنا ہے۔ میں نے سوچا۔ پھر غنی نواز کی موت پر افسوس کیوں؟ لیکن نہ جانے کیوں میں تھوڑی دیر کے لئے غم کی دھوپ میں تپتا رہا۔

غنی نواز کی موت کی خبر کسی اخبار میں نہیں چھپی۔ نا ہی کسی شاعر نے قطعہ تاریخ نکالا۔ کوئی دو پیسے کوڑی کا آدمی مر جاتا تو اخبارات میں خبریں شائع ہوتیں۔ کئی بیکار شاعر قطعہ تاریخ نکالتے اور مرنے والے کے عزیزوں کی سفارش سے اخبارات میں شائع کرواتے، خواہ مرنے والے کی زندگی میں اُسے کبھی پانی کے لئے بھی نا پوچھا ہو لیکن مرنے کے بعد اُن کی محبت بگولے کی طرح اُٹھتی۔ پھر ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔ غنی نواز کے ساتھ میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا کیونکہ اُس کے پاس روپے تھے نا ہی دو کوڑی۔ بنا پیسے کوڑی کے وہ سانس سانس جیا۔ اُس کی سانسوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ دنیا میں یہی تو ہوتا ہے نا۔

غنی نواز جھونپڑے میں پیدا ہوا۔ چاروں طرف پھیلی گندگی میں پلا بڑھا۔ ذرا ہاتھ پاؤں نکلے تو محنت مزدوری کے سمندر میں ڈھکیل دیا گیا۔ اُس سمندر میں غنی نواز ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ بچپن ہی میں جوانی آ گئی۔ جوانی میں ہی بڑھاپے کی سرحدوں کو چھو لیا۔ بچپن کیا تھا؟ جوانی کیسی تھی؟ اُسے پتہ ہی نہیں چلا لیکن بڑھاپے کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ جب بستر پر لیٹتا ہے تو ہاتھ پاؤں کی نسیں تڑ تڑ کرتی ہیں اور دماغ کی رگیں پھٹ پھٹ۔

www.taemeernews.com

غنی نواز ایسا آدمی نہیں تھا کہ اُس کی طرف کوئی توجہ دیتا لیکن مجھے غنی نواز کے انداز نے متوجہ کرلیا۔ گریبان کے دو بٹن کھلے۔ منہ میں کبھی سلگتی بیڑی، کبھی بجھی ہوئی۔ ہونٹوں میں بیڑی دبا کر وہ بڑے ٹھاٹ سے منہ بنا بنا کر باتیں کرتا۔ باتیں کرتے وقت اُس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی بیڑی ہونٹوں کی حرکت کے ساتھ کبھی دائیں کبھی بائیں چکر لگاتی۔ وہ اکثر چائے کی دوکان کے سامنے رکھے لکڑی کے بوسیدہ بینچ پر بیٹھ کر کبھی سیاست کی بساط بچھاتا۔ کبھی اپنے اِردگرد کے لوگوں کی۔ لوگ اُس کی باتوں پر دھیان کم دیتے لیکن اُن کی توجہ اُس کے ہونٹوں میں دبی بیڑی کی حرکت پر ہوتی۔ اُس کی عادت تھی کہ چائے پینے سے پہلے وہ پان کی ٹپری پر سے بیڑی کا بنڈل خریدتا پھر وہاں پان بنواتا۔ کھلا ہوا پان ہاتھ میں لے کر بینچ پر بیٹھ جاتا۔ لوگ اُس کے اِردگرد بس وقت گذاری کے لئے بیٹھ جاتے۔ کبھی کبھی وہ خاموش ہوتا تو کوئی منچلا اُس کی بات شروع کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی نُکتہ چھوڑ دیتا۔ ''اُستاد بڑا غضب ہوگیا۔ وہ بالے ہے نہ۔ نانو! اُس کی لونڈیا نتھو فقیر کے لونڈے کے ساتھ ٹانکا بھڑا کر بھاگ گئی۔ رات سے محلے میں افواہ پھیلی ہے کہ اُن کا معاملہ کئی ماہ سے تانکا جھانکی کا چل رہا تھا اور کل رات میں بھاگا بھاگی ہوگئی۔'' تھوڑی دیر بعد غنی نواز نے ردِعمل ظاہر کیا۔ ''ماں باپ اندھے ہیں؟ محلے والے اندھے ہیں؟ پہلے سے جانچ پڑتال کرنا چاہیے۔ گلی محلے میں کوئی چھوکرا بار بار آئے تو دیکھنا چاہیے۔ میری گلی میں کوئی نیا آدمی ایک سے دوبار آتا ہے تو میرے کان کتے کی مافق کھڑے ہوجاتے ہیں اور ناک آنے والے کل کی بو سونگھ لیتی ہے۔ پچھلے سال ہی میں نے دو کیس پکڑے تھے۔'' اس جملے کو غنی نواز نے بڑے فخریہ انداز میں کہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پان تھا لیکن دوسرے ہاتھ سے اُس نے اپنا کالر پکڑ کر اُٹھایا تھا۔

غنی نواز کو میں نے کبھی لڑتے نہیں دیکھا لیکن ایک بار پولس سے بھڑتے دیکھا۔

شہر میں افواہ پھیل گئی تھی کہ بابری مسجد شہید کردی گئی۔ مسجد کو کون توڑ سکتا ہے؟ سارے شہر میں بات پھیل گئی۔ مسلمان سڑکوں پر جمع ہوگئے۔ مسجدیں خالی پڑیں تھی۔ سڑکیں آباد تھیں۔ چیخ پکار سے فضاء آلودہ تھی۔ مسلمان ملباریوں کی طرح لنگی لپیٹ لپیٹ کر آستینیں چڑھا چڑھا کر اُن کے نادیدہ دشمن کو للکار رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی پولس کی گاڑیوں کے سائرن گونجنے لگے۔ جیسے جیسے سائرن کی آواز قریب آنے لگی۔ مسلمانوں کی لنگیاں برابر ہونے لگیں۔ آستینیں اُترنے لگیں اور بھیڑ میں پتھراؤ شروع ہوگیا۔ کچھ لمحہ پہلے کچھ جیالوں نے کچھ دوکانوں کی توڑ پھوڑ کی اور آگ بھی دِکھادی۔ پولس کے سائرن کے ساتھ آگ بجھانے والی گھنٹہ گاڑی بھی دوڑ رہی تھی۔ شہر کی شاہراہ پر مجمع میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں

www.taemeernews.com

کی طرف بھاگ رہے تھے۔ لیکن پولس کے جوان گاڑی میں سے کود کود کر اپنی پوزیشن لے رہے تھے اور گولیاں برسا رہے تھے۔ جیسے سامنے دشمن کی فوج ہو۔ کچھ لوگ شہتیر کی طرح گر کے تڑپے اور ساکت ہو گئے۔ کچھ زخمی ہو کر چیختے چلاتے بھاگے اور کچھ گر کر بے ہوش ہو گئے۔ پولس کا گولیاں چلانے سے جی بھر گیا تو کرفیو کا اعلان ہونے لگا۔ چند لمحوں بعد پولس کے ساتھ ہی سارے شہر میں سناٹے کا راج تھا۔ کبھی کبھی پولس کی کالی گاڑیاں ڈھرڈھر کرتی گذرتی تھیں۔ کبھی پولس والے بوٹ کھڑکھڑاتے گذرتے تھے۔ اُس وقت فضاء میں دھم دھماتی آواز پھیل کر لوگوں میں خوف جگا دیتی تھی۔

دوسرے دن بھی کرفیو کا اعلان ہوا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پولس نے دھر پکڑ شروع کر دی۔ غنی نواز کی گلی کے نکڑ پر ایک غریب ہندو کو کچھ غنڈوں نے دھر لیا۔ اُس کی جی بھر کر دھلائی کرنے کے بعد وہ غنڈے محلے کی پتلی پتلی گلیوں سے بھاگ گئے۔ محلے والوں نے اُس بے ہوش آدمی کو چار پہیوں والی گاڑی میں ڈالا اور دواخانے کی طرف دوڑ پڑے۔ زخمی ہندو تھا۔ اُس کی جان بچانے کی کوشش کرنے والے مسلمان۔ راستے میں کئی بار پولس والوں نے اپنی گاڑی سے اُتر کر اُنھیں گھیرا۔ پھر جلدی دواخانہ جانے کی ہدایت کر کے چلتے بنے۔ ایک بار جب اُنھیں پولس والوں نے روکا تو ایک آدمی بولا۔ ''پولس وین میں ڈال کر جلدی دواخانہ پہنچاؤ صاحب نہیں تو یہ مر جائے گا۔'' ایک پولس والا جو انسپکٹر معلوم ہوتا تھا۔ گرج کر بولا۔ ''تو ہمارا صاحب ہے۔ جو حکم چلاتا ہے۔'' ایک نے کہا۔ ''ناک رے بھڑویا لا گاڑی مدھے۔'' (ڈال رے اس بھڑوے کو گاڑی میں) دوسرے پولس والے ہنسنے لگے۔ پولس والوں کی فائرنگ جاری تھی کے زخمی کو لے جانے والے راستہ ناپنے لگے۔ ایک شخص بولا۔ ''کیا برا زمانہ آ گیا ہے۔ ہندو پولس ہندو زخمی کو بچانے کی کوشش نہیں کر رہی ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ یہ بھی اللہ کا بندہ ہے۔'' وہ لوگ تیزی سے دواخانے کی طرف دوڑنے لگے۔

دوسرے دن پولس نے زخمی کا بیان لیا۔ اُس نے جگہ کی نشاندہی کی لیکن مارنے والوں سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ پولس نے اُس گلی پر دھاوا بول دیا۔ جسے پایا گاڑی میں بھر لیا۔ ایک ہی گھر کے کئی افراد کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر پولس والے گاڑی میں بھر رہے تھے۔ اُس وقت غنی نواز کی آواز اُبھری۔ غصہ، خوف، حیرت مل کر اُس کی آواز کو کرخت بنائے ہوئے تھے۔ اُس نے پولس والوں کو للکار کر کہا۔ ''بے گناہوں کو پکڑ رہے ہو۔ چھوڑ دو اُن کو۔ ایک ہی گھر کے سب لوگوں کو لے گئے تو اُن کے بچے کیا کریں گے؟ یہ سب بے قصور ہیں۔'' ایک پولس والے نے فوراً پستول تان کر غنی نواز کو نیچے سے اوپر دیکھا اور

www.taemeernews.com

پستول تانے غنی نواز کی طرف بڑھا۔ اُس کی کالر پکڑ کر بولا۔ ''سالے تو بھی بے قصور ہے لیکن تجھے بھی ہم لے جائیں گے۔'' غنی نواز کو معلوم نہیں تھا کہ پولس آخر پولس ہوتی ہے۔ ظالم اور مظلوم اُن کی لسٹ میں ایک ہوتے ہیں۔ مجرم اور منصف کا خانہ بھی اُن کی ڈائری میں ایک ہی ہوتا ہے۔ غنی نواز گلی والوں کو چھڑانے گیا اور خود ہی پولس کے کانٹے میں پھنس گیا۔ کئی کالے بھجنگ پولس والوں نے دیو کی طرح اُسے جکڑ لیا تو وہ کانٹے میں پھنسی مچھلی کی طرح چھٹپٹانے لگا۔ اُسی حالت میں غنی نواز کو کسی گیند کی طرح گاڑی میں پھینک دیا گیا۔

کئی دنوں بعد غنی نواز جیل سے باہر آیا۔ اب وہ کورٹ کچہری کے چکر میں اُلجھ گیا تھا۔ وہ عدالت کے کٹہرے میں بڑے اسٹائیل سے کھڑا ہوتا۔ گریبان کے دو تین بٹن کھلے رہتے۔ یہاں منہ میں بیڑی رکھنے کی گنجائش نہیں تھی ورنہ وہ چوکتا نہیں۔ جج نے کئی بار اُس کے اسٹائیل کو گھور کر دیکھا۔ غنی نواز پر جج کو گھورنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ تو بے گناہ تھا۔ باعزت بری ہونے کا اُسے پورا یقین تھا لیکن جج کو شاید اُس کے اسٹائیل سے چڑ تھی۔ اس لئے جج نے تمام ملزمین کو باعزت بری کر دیا اور غنی نواز کو مجرم قرار دے کر دو سال قید با مشقت ٹھونک دی۔ غنی نواز پسینہ پسینہ ہو گیا۔ پہلی بار غنی نواز کو معلوم ہوا کہ قانون واقعی اندھا ہوتا ہے۔ غنی نواز کے وکیل نے اُسے دِلاسا دیا کہ اعلیٰ عدالت میں کیس جائے گا فکر مت کرو۔

غنی نواز کو اعلیٰ عدالت سے لمبی لمبی تاریخیں ملنے لگیں۔ ان تاریخوں کو اُس کا وکیل نپٹ لیتا تھا لیکن سماج غنی نواز کو جھٹک دیتا تھا۔ جہاں بھی وہ کام کرتا وہاں پتہ چلتا کہ اُس پر فساد کا کیس ہے تو کارخانہ دار کے کان کھڑے ہو جاتے۔ دوسرے دن وہ غنی نواز کو کام پر سے چلتا کر دیتا۔ کام کرانے والا کچھ جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔ بس وہ اتنا ہی کافی سمجھتا تھا کہ غنی نواز پر فساد کا مقدمہ چل رہا ہے۔ اس میں ہندو، مسلمان کی تخصیص نہیں تھی۔

غنی نواز کے پیچھے جس طرح کورٹ کچہری پڑی ہوئی تھی اُسی طرح بے روزگاری نے بھی اُس کا دامن تھام لیا تھا۔ وہ چھڑانے کی لاکھ کوشش کرتا لیکن بے روزگاری محبوبہ کی طرح والہانہ لپٹ لپٹ جاتی تھی۔

ایک دن محلے میں آواز اُبھری۔

کھالے وڑا۔ ہو جا بڑا۔

آجا پاس۔ دور کیوں کھڑا۔

لے لے مزہ۔ کھالے وڑا۔

www..taemeernews.com

یہ آواز غنی نواز کی تھی۔ آواز لگاتے وقت چلی یا بھی بیڑی اُس کے ہونٹوں میں دبی رہتی اور گریبان کے دو بٹن کھلے رہتے۔

غنی نواز کی آواز سے بچے، جوان، بوڑھے مانوس ہو چلے تھے۔ آواز کے آتے ہی بچے اُسے گھیر لیتے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ میں خوانچہ خالی ہو جاتا۔

غنی نواز کے کیس کی تاریخیں پڑتی رہیں۔ وڑا فروشی سے اُس کی گھر گرہستی چلتی رہی۔ ایک دن آواز نہیں آئی۔ دوسرے دن بھی غائب۔ سن گن لینے پر معلوم ہوا کہ غنی نواز کی آواز ہمیشہ کیلئے بند ہو گئی ہے۔

شاید ہماری عدالت میں اتنا بوتا نہیں تھا کہ بے گناہ، معصوم، غنی نواز کو باعزت بری کر دے۔ اس لئے موت نے اُسے زندگی سے ہی بری کر دیا۔ ☆☆☆

www.taemeernews.com

رونے کی آواز

گوتمی بڑی دھاکڑ عورت تھی۔ آج بھی محلے میں اس کی دھاک تھی۔ جوانی میں سوا سیر رہی ہوگی۔ خدوخال بیتے دنوں میں خوبصورت ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔ جو بھی دیکھتا ہوگا اس پر فدا ہو جاتا ہوگا۔ میں اسے یہ باتیں بتانا چاہتا تھا لیکن وہ بولے جا رہی تھی۔ ایک بات ختم ہوتی نہیں تھی کہ دوسری شروع کر دیتی۔ میری اس کی جان پہچان چند دن کی تھی۔ ان چند دنوں میں، میں اس کے قریب آ گیا تھا۔ اتنا قریب کے وہ مجھے اپنے من کی بات بتانے کے لئے تیار ہوگئی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں تمہارے گھر کے سامنے سے گذر رہا تھا تو تمہاری آواز صبح کی خاموش فضاء میں بڑی بھلی لگی۔ ایسی جیسے جنگل کے سناٹے میں کہیں دور گرتے جھرنے کی مدھر آواز اپنی طرف بلاتی ہے۔ میں رُکا، اس کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ ''تمہاری آواز میں بڑی کشش ہے۔ یہی کشش مجھے تمہارے قریب لے آئی۔'' میں نے دوبارہ کہا۔

میں نے محسوس کیا، اس کے من میں اندر ہی اندر بہار کے جھونکے مچلنے لگے ہوں۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور ہنسی کے لیے پھڑپھڑاتے ہونٹ خوشی کا اظہار کر رہے تھے وہ مسکراتے ہوئے بولی ''بابو! کیوں من بہلا رہے ہو۔ صرف میری آواز تمہیں مجھ تک کھینچ لائی یہ میں مان نہیں سکتی۔ بنا مطلب کے اس بستی میں کوئی قدم دھرتا نہیں۔ تمہارا مطلب کچھ اور ہو تو بولو۔ کہو تو کسی کو بلا دوں یہاں بہت ساری رنگینیاں ہیں۔'' پھر معنی خیز ادا سے مسکرانے لگی تھی۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں صرف اس کی آواز سن کر یہاں آیا ہوں۔ اسے دیکھنے کی خواہش دوسری بات ہے۔

اس نے ذرا اونچی آواز سے کہا۔ ''اور مجھے دیکھنے کے بعد تمہارا اِرادہ کچھ اور ہو گیا، ہے نا۔ ویسے میری عمر ابھی ایسی نہیں کہ کوئی مجھے ناپسند کر دے۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''ہاں! جن کی عمر بچپن کی اور دل بچپن کا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو بوڑھاپے کی منزل پر پہنچا ہوا نہیں سمجھتے اور پھر تمہاری عادت بھی ایسی ہے کہ تم ہار ماننے والی نہیں ہو۔''

www.taemeernews.com

''تم نجومی بھی ہو؟ تم نے یہ کیسے جانا کہ میں ہار ماننے والی نہیں ہوں؟ یہ سچ ہے کہ میں نے زندگی میں کبھی ہار کو اپنے گلے کا ہار نہیں بنایا۔''

''تم نے اپنی زندگی میں کیا کیا اور کیسے کیا یہی تو جاننا میرا مقصد ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ اُٹھی دوسرے کمرے میں گئی چند لمحوں بعد ایک گلاس میں شراب بھر لائی۔ مجھ سے پوچھا۔ '' کچھ شوق پانی کرتے ہو؟'' میں نے انکار میں گردن ہلادی۔ اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور لمحہ بھر میں خالی کردیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور گالوں پر سرخی دوڑنے لگی۔ چند ثانیے وہ ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھتی رہی۔ دیوار پر کچھ تصویریں لٹک رہی تھیں۔ ایک تصویر اس کی بھی تھی۔ یہ تصویر اس کی بھرپور جوانی کے دنوں کی تھی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ اپنی جوانی کی تصویر میں کھو کر اپنی ماضی کے بکھرے پرزے جمع کرنے کی کوشش کررہی ہو۔

کچھ دیر بعد کہنے لگی۔ ''بابو کیا بتاؤں بتانے کیلئے تو پہاڑ سی کہانیاں ہیں لیکن کہاں سے بتاؤں؟ یہی نہیں سوجھ رہا ہے۔ زندگی کیسے کیسے کچے پکے راستوں پر سے گذر کر یہاں پہنچی اور تھم گئی۔ جب چمن میں پھول کھلتے ہیں نا بابو تو بھونرے نہ جانے کہاں کہاں سے آجاتے ہیں اور جب چمن اُجڑ جاتا ہے تو بھونرے اپنے آپ کسی اور چمن کا رُخ کرلیتے ہیں۔'' کچھ دیر پہلے اس کی آنکھوں میں جو چمک آئی تھی اُس کی جگہ ویرانی نے لے لی تھی۔

میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ''بھئی واہ! تم نے تو شاعری میں باتیں شروع کردی، تم اتنی اچھی باتیں سوچ سکتی ہو مجھے اس کی خوشی ہے۔'' پھر میں نے بڑے ہی نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ تو زندگی کا دستور ہے۔ تم نے سنا ہوگا۔ ''سکھ کے سب ساتھی دکھ میں نا کوئے.....'' تمہاری عمر ہی دکھ بھری آگئی ہے اس کے باوجود تم بڑے دم خم سے جی رہی ہو۔ تمہارے تو عیش ہیں۔ دارو پیتی ہو، اچھا کھاتی ہو، اچھے کپڑے پہن رکھے ہیں، زیورات کی بھی کمی نہیں ہیں۔ سب کھرے سونے چاندی کے معلوم ہوتے ہیں۔ غم کاہے کا؟''

اُس نے مسکرا کر شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن افسوس اس کا ہے کہ تم جوانی کے دنوں میں نہیں ملے۔ اُس وقت ملے ہوتے تو تمہارے ساتھ جگ جگ جی لیتی، تم نے بہت دیر کردی بابو! جب چڑیا چگ گئی کھیت والی بات ہے۔''

میں نے گھڑی دیکھی اُس کے کاروبار کا وقت ہوچلا تھا۔ اُس کی آمدنی کا ذریعہ یہی کاروبار تھا۔ لوگ اُس کے گھر میں بنی کھولی کا استعمال گھنٹہ دو گھنٹے کیلئے کرتے اور اُسے معقول کرایہ دے جاتے۔

www.taemeernews.com

اس دھندے سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ وہ مزے سے گذر بسر کر رہی تھی۔

گوتمی میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ چلتے چلتے میں سوچنے لگا۔ جوانی میں بڑی چونچال رہی ہوگی۔ بڑی باتونی رہی ہوگی۔ کبھی کبھی بڑی اچھی بات کہہ دیتی ہے لیکن وہ سمجھ رہی ہے کہ مجھے اُس کے جسم سے کچھ لینا ہے لیکن مجھے تو صرف اُس کی کہانی جاننا تھی۔

دوسرے دن میں جب گوتمی کے گھر پہنچا تو وہ کوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ چک پک تھی۔ بدن سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ چہرہ بھی نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔ گالوں کی سُرخی بھی گہری ہوگئی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ بڑی بنی ٹھنی ہو، کہیں جا رہی ہو؟ یا پھر کوئی پرانا شناسا آنے والا ہے؟''

اُس نے سرد آہ کھینچ کر نا کام معشوقہ کی طرح کہا۔ ''ہماری قسمت کہاں کہ کہیں جائیں اور کوئی پرانا شناسا ہم تک آئے۔ ہماری جیسی عورتوں سے شناسائی تب ہوتی ہے جب ہمارا جسم کسی کو بلاتا ہے۔ اب تو وہ بات نہیں رہ گئی۔ بس تمہارا انتظار کر رہی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''دیکھو گوتمی! میں ویسا نہیں ہوں جیسا تم سمجھ رہی ہو۔ میں اپنی جوانی بازار میں لٹانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ ویسے ایک بات بتا دوں کہ اس محلے میں جو لڑکیاں اور عورتیں دروازے پر کھڑی رہتی ہیں، اُن سے زیادہ کشش تم میں ہے۔''

میری بات سن کر اُس نے مجھ پر بڑی معشوقانہ نگاہ ڈالیں اور بولی۔ ''تم نے مجھے باتوں سے ہی خوش کر دیا۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ بھگوان قسم جب میرے اوپر آم کے بور کی طرح جوانی پھٹ پڑی تھی اُس وقت کسی نے خوشی بھرے دو بول نہیں بولے۔''

وہ اُٹھی۔ اندر گئی۔ گلاس بھر لائی۔ کل کی طرح مجھ سے پوچھا۔ ''پیو گے؟'' میں نے نا میں گردن ہلائی اُس نے غٹا غٹ گلاس خالی کر دیا۔ سرہانے سے بیڑی سگریٹ نکالے۔ بیڑی خود جلائی۔ سگریٹ میری طرف بڑھا کر بولی۔ ''سگریٹ پھونکنے میں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا!'' میں نے اُس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر سلگائی اور دھوئیں کے مرغولوں میں اُس کا ماضی تلاش کرنے لگا۔

جب گوتمی کی بیڑی ختم ہوئی تو وہ کہنے لگی۔ ''گھر سے بھاگ نکلی تھی۔ تب دس بارہ سال کی تھی۔ اسکول کے راستے پر ایک گھر سے چھم چھم، ٹھم ٹھم ..... کی آواز آتی تھی۔ بس ایک دن ٹھم ٹھم اور چھم چھم کی آواز سن کر قدم جم گئے اسکول کا بستہ لے کر وہیں چلی جاتی۔ پیروں میں گھنگرو باندھ کر اچھا ناچنے لگی اور فلمی گیت بڑی ادا سے گانے لگی۔ تب گھر والوں کو پتہ چلا کہ میں نے سال بھر کیا گل کھلائے۔ گھر والوں نے اسکول چھڑا دیا۔ رات دن نگرانی کرنے لگے۔ گھر کے کمرے میں قید کر دیا۔ میں بغیر گھنگرو

www.taemeernews.com

باندھے ریاض کرتی رہی۔ دو سال اسی طرح بیت گئے ایک دن موقع پا کر گھر سے بھاگ نکلی۔ ناچ سکھانے والی کے گھر پہنچ کر بولی۔ ''مجھے اسی وقت کہیں دور بھیج دو۔'' اُس نے مجھے پونہ پہنچا دیا۔ اندور سے پونہ پہنچی تو آزاد تھی۔ ایک کوٹھے پر خوب ناچی گائی۔ دور نزدیک شہرت بھی ہوئی لیکن وہاں من نہیں لگا۔ بمبئی چلی گئی۔ یہاں کی دنیا میں بڑی چمک دمک تھی۔ سورج جیسے ہی چوپاٹی پر سے گذر کر سمندر میں ڈبکی لگاتا۔ شہر روشن ہوتا تو میرے پیروں میں گھنگرو بندھ جاتے اور من میں روشنی پھوٹ پڑتی۔''

وہ کچھ دیر رکی۔ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''یہاں ایک گبرو جوان روز آتا تھا۔ ایک دو گانے سنتا ڈھیر سارے نوٹ نچھاور کرتا اور چلا جاتا۔ اُس نوجوان نے میرے دل میں گدگدی پیدا کر دی۔ ایک دن میں نے اُس سے کہا۔ مجھے یہاں سے لے اُڑو۔ میں تمہارے ساتھ کہیں بھی چلنے کے لئے تیار ہوں۔ تم جس طرح چاہو میں رہنے کیلئے تیار ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ جب کمرے کی خاموشی گراں گذرنے لگی تو میں نے اُسے ٹھوکا دیا۔ وہ چونکی میری طرف دیکھنے لگی تو میں نے کہا۔ ''پھر کیا ہوا گوتمی؟''

وہ کہنے لگی۔ ''وہ بھی تمہارے طرح پیار سے گوتمی کہتا تھا۔ آج تم نے بیتے دنوں کے زخموں کے منہ کھلوا دیئے۔ میرے بدن میں یادوں کا ریلا سا آ گیا ہے''۔..... ''لیکن تم تو ایسے بیٹھی تھیں جیسے تمہارے من کے سارے کواڑ بند ہو گئے ہوں۔'' میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ مسکرائی اور بولی۔ ''گذرا ہوا زمانہ اچھا گذرا ہو یا برا۔ اسکی یاد بڑی دکھ بھری ہوتی ہے۔ انسان کو جگہ جگہ غلطیوں کی یاد دلاتی ہے۔ اُسے بیان کرتے ہوئے کرب سے گذرنا پڑتا ہے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوا تم شاعرہ یا ادیب نہیں بنیں ورنہ جتنے شاعر اور کہانیاں لکھنے والے ہیں اُن سب کو پچھاڑ دیتیں۔'' وہ ہنسی اور بتانے لگی۔ شاعروں اور لیکھکوں کی بات مت کرو۔ کتنے شاعر ایک ایک بوتل پر اپنا برا کلام دے جاتے تھے۔ کتنے لیکھک اور پتر کار جھک مارتے تھے۔ شراب پیتے، گلی سے دلی پہنچتے، پھر ساری دنیا ان کے الفاظ میں سمٹ جاتی تھیں۔ بات دنیا کی بربادی کی کرتے کرتے میری یا کسی اور کی جوانی تک پہنچ جاتے..... سالے..... بیٹھے بیٹھے دنیا کو سدھارنے کی بات کرتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''گالی مت دو بے چاروں کو! بات کرنے سے ہی اُن کا غم ہلکا ہوتا ہے۔'' اُس نے غصے سے کہا۔ ''باکڑا توڑ سالوں کو گالی نہ دوں تو کیا کروں۔ کیا وہ تمہارے سگے سائیں لگتے ہیں۔ بہت سے دیکھے مگر بمبئی میں جتنے نکمے لیکھک اور شاعر ملے کہیں نہیں ملے۔''

میں نے اس کا ذہن موڑنے کے لئے پوچھا۔ ''پھر وہ نوجوان تمہیں لے بھاگا یا تم اُس کو لے

www.taemeernews.com

بولی۔ ''وہ حرام کا جنا پولی کم تھا۔'' میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تو اس نے کہا۔ ''پولی کم نہیں سمجھتے؟ ارے چونی کھسلیل چھکا۔'' اس نے ذرا سا لٹک کر دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر پولی کم کی وضاحت کی تب میری سمجھ میں آیا۔

پھر بولی۔ ''تم بھی اسی کے بھائی بند لگتے ہو۔ تمہارے اندر زندگی کی خوشگوار طمانیت جاگ ہی نہیں رہی ہے۔ اس عمر میں اتنی ٹھنڈک اچھی نہیں ہوتی پیارے۔'' اس کا اور میرا قہقہہ ساتھ ساتھ چھوٹا۔ میں اس کی طرف داد دینے والے انداز میں دیکھنے لگا اور کہا۔ ''اتنی اچھی اور گاڑھی زبان تم نے کہاں سیکھی؟''

''ارے بابا! اسی حیدرآباد میں جہاں وہ پولی کم مجھے ایک کوٹھے پر بیچ کر بھاگ گیا تھا۔ بکنے کے بعد مجھے معلوم ہوا تھا کہ میں بیچی جا چکی ہوں۔ عورت بیچاری سدا بکتی آئی ہے۔'' اس نے سرد آہ بھری پھر کہنے لگی۔ ''یہاں بکنے کا مجھے بالکل افسوس نہیں ہوا۔ یہاں کے کوٹھوں پر بیگم پاشاؤں، باجی پاشاؤں اور بیگم صاحباؤں کے بڑے ناز نخرے تھے۔ ان کی باتوں میں بڑا مزا آتا تھا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا لیکن ان کے جیسے زبان نہیں بول پائی۔ بیگمات بات کرتی تھیں تو جیسے پھول جھڑتے تھے۔ چلتی تھیں تو جیسے مورنی چل رہی ہو۔ بڑی نازک، گل اندام، مزاج چھوئی موئی۔ ہاتھ لگاؤ تو تین جگہ ٹیڑھی ہوتی تھیں۔ مجھے تو وہاں بہت اچھا لگتا تھا۔ ناچو گاؤ دونوں ہاتھوں سے دولت بٹورو اور تھک کر سو جاؤ۔ کئی دن گذر گئے۔ میں ان بیگمات میں کھپ گئی۔ ایک دن مجھے خوب سجایا اور سنوارا جانے لگا تو میں نے پوچھا بیگم پاشا! بتاؤ نا مجھے کیوں سجایا جا رہا ہے؟ کہیں آپ میری شادی تو نہیں کر رہی ہیں؟ بیگم پاشا ہنسیں پھر بولیں۔ ''پہلی اور آخری شادی۔'' میں حیرانی سے دیکھنے لگی تو لڑکیاں بالیاں ہنسنے لگیں۔ جب رات ہوئی تو مجھے ایک لمبے تڑنگے پہلوان کے ساتھ موٹر میں بٹھا کر نواب کی کوٹھی پر پہنچا دیا گیا۔ جب میں نواب کے کمرے میں جا رہی تھی تو پہلوان نے کہا۔ ''گھبرانا مت میں باہر ہوں۔ نواب صاحب بس آتے ہی ہوں گے۔''

میں حیران نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ مسہری پر سونے کا پاندان رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک چاندی کا اگلدان دھرا تھا۔ ایک ٹیبل پر شراب کی بوتلیں اور گلاس سجے تھے۔ ابھی میری حیرانی کم نہیں ہوئی تھی کہ آواز آئی۔ ''ارے آپ آ گئیں۔ ہمیں تو آپ کا انتظار کاٹ کھائے جا رہا تھا۔'' میں نے دیکھا ایک ادھیڑ عمر کا دھان پان آدمی منہ میں پان دبائے آیا اور بولتے بولتے مسہری پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میرا جائزہ لیتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ ''سُبحان اللہ! آنکھوں سے مت پلائیے۔ ذرا جام و صبو تھامیے اور ہمارے مضطرب دل کو سکون بخشیے۔'' میں نے نواب کی آنکھوں میں ہونٹوں کی طرح سُرخی دوڑنے لگی تو وہ بولے۔ ''اجی کچھ تو سنائیے۔ کوئی تھرکتی بھڑکتی غزل یا گیت جس سے جسم و جاں پھڑک اُٹھے۔''

www.taemeernews.com

میں نے کوٹھے پر سیکھی ہوئی ایک غزل چھیڑ دی۔ نواب بار بار اُٹھتے اور ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھتے۔ کبھی کبھی جام بھرنے کا اشارہ کرتے۔ جیسے جیسے رات بیت رہی تھی نواب پر نشہ حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ آخر پچھلے پہر نواب شراب میں ڈوب کر بے جان ہو کر لڑھک گئے۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نواب کے سرہانے نوٹ کی کئی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں جو میرے لئے ہی تھیں۔ میں نے وہ نوٹ اُٹھا لیے۔ دروازہ کھولا تو وہی پہلوان کھڑا تھا۔ میں نے غصے سے کہا۔ ''کہاں پھنسا دیا تھا مجھے۔ نواب مردہ سانپ کی طرح پڑا ہے۔'' پہلوان نے کہا۔'' روز ایسا ہوتا ہے۔ یہاں عورت روز خریدی جاتی ہے۔ کل تم پھر خریدی جاؤ گی۔ آزادی چاہتی ہو تو میرے ساتھ نکل چلو۔'' میں نے موقع غنیمت جانا اور پہلوان کے ساتھ بھاگ نکلی۔ ہم سیدھے کاچی گوڑہ اسٹیشن پہنچے اور پونا کا ٹکٹ کٹا لیا۔''

پونا پہنچ کر ہم نے ایک مکان کرائے پر لیا اور رہنے لگے۔ پہلوان نے کہا۔'' یہ دھندہ بند۔'' میں نے کہا۔'' بند۔'' پہلوان بولا۔'' تیرے سے شادی نہیں کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔'' مت کر۔'' میں بھی شادی کر کے اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتی تھی۔ مزاج آزاد تھا۔

''پونا میں سال بھر زن سے بیت گیا۔ اب کڑا وقت آ گیا تھا۔ میرے پاس کی رقم ختم ہو چکی تھی۔ پہلوان بھی کڑکا ہو گیا تھا۔ وہ پیسہ نکالنے کیلئے مجھے ستاتا اور تان جھگڑے پر ٹوٹتی۔ پہلوان دیکھنے میں بڑا کڑیل جوان نظر آتا تھا۔ اس کی جوانی دکھاوے کی تھی۔ اس کی مردانگی نے میرے بدن کو کبھی راحت نہیں پہنچائی۔ ایک دن ہمارے بیچ مہابھارت ٹھنی تو میں نے پہلوان کی مردانگی کی دم پر پاؤں رکھ ہی دیا۔ پہلوان نے میرے بال پکڑ کر دو طمانچے مارے۔ میرا سامان پھینک دیا میں سامان اُٹھا کر سیدھی بمبئی آ گئی۔ یہاں میری جان پہچان کی ایک لڑکی نے مجھے ایک ہوٹل میں ڈانس کرنے اور گانے کیلئے رکھا دیا۔ اسی سالی رنڈی نے شراب کی عادت لگا دی۔ پہلے گھونٹ گھونٹ پیتی تھی۔ اب بوتل تک پہنچ چکی ہوں۔''

میں نے کہا۔'' کیوں پیتی ہو جب اس کی برائی جان گئی ہو تو؟'' اُس نے بڑا گہرا جواب دیا۔ ''بابو! کبھی کبھی برائی بھی انسان کی ضرورت بن جاتی ہے۔ شراب کی برائی اب میرے لئے برائی نہیں وہ گئی۔ اب وہ اچھائی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بنا پیئے چین نہیں۔ بنا پیئے نیند نہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ خلا میں گھورنے لگی۔ اس کی خاموشی اسے دور لے جا چکی تھی۔ شاید وہ ماضی کے سمندر سے یادوں کے موتی لانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

چند منٹ بعد میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی'' تم بڑے بدمعاش ہو۔ ایک عورت کی بند

www.taemeernews.com

مٹھی کھلوار ہے ہو۔ آج تک تمہارے علاوہ سچ، وہ بھی من سے سچ کسی کو نہیں بتایا۔ نام تک غلط بتایا۔ سب کے سب فلمی ہیروئینوں کے۔'' وہ مسکرائی اور بتانے لگی۔

''بمبئی مجھے راس نہیں آئی۔ جب بھی گئی اکتائی۔ دوسری طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ ان ہی دنوں یہاں کے ایک کارخندار کو میں بچ گئی۔ وہ مجھے یہاں لے آیا۔ یہاں پر اس کا سارا کاروبار اس کے سالوں نے ہتھیا لیا تھا۔ وہ بیچارا یبوست سے مر گیا۔'' میں نے اس کے اُداس چہرے پر نظر ڈالی۔ اس نے رندھے گلے سے کہا۔ ''یہ کارخندار پہلا مرد تھا جو مجھے عقل اور جسم سے بھا گیا تھا لیکن موت اس کو لے بھاگی۔''

گوتمی کی آنکھوں میں ویرانی در آئی تھی اور اس کی ویران آنکھوں سے آنسو ماضی بن کر بہہ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''معاف کرنا گوتمی! تمہیں کچھ دے تو نہ سکا لیکن تمہارے ماضی کو کرید کرید کر زخم ضرور ہرے کر دیئے۔'' گوتمی نے کہا۔ ''نہیں بابو تم نے اچھا کیا۔ مجھے ایسے دکھ کا برسوں سے انتظار تھا۔ برسوں سے دل پر بھاری سل رکھی محسوس ہوتی تھی آج وہ بوجھ ہٹ گیا۔ لیکن.....'' اس کی آنکھیں پھر گھر کی چھت پر مرکوز ہو گئیں اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ نظریں چھت سے گذر کر آسمانوں میں کسی کو تلاش کرنے لگی ہوں۔

میں نے کہا۔ ''شاید ابھی تمہارے من کا بوجھ پوری طرح نہیں اُترا۔'' اس نے چند لمحوں بعد میری طرف مڑ کر کہا۔ ''ہاں میں جو بمبئی سے اُکتائی اُکتائی سی رہتی تھی اس کی وجہ ہے۔ میں اپنی کوکھ میں پلنے والی جان کی قاتل ہوں۔ مجھے اتنا شعور نہیں تھا۔ تب ہی پتہ نہیں کس کے بیج سے میری کوکھ ہری ہو گئی تھی۔ گھر مالکن اور ساتھ والیوں نے بہت سمجھایا، پٹایا تب میں نے اس جان کو مار ڈالا۔'' پھر اس کے رونے کی آواز سارے میں پھیل گئی.....اس نے روتے روتے کہا۔ ''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے رونے کی آواز میں اس ننھی سی جان کی آواز بھی شامل ہو گئی ہے۔ یہی رونے کی آواز مجھے کبھی کبھی بے چین کر دیتی ہے۔ گھر سے بھاگنے کا دکھ تو تھا ہی ایک جان کو قتل کرنے کی سزا بھی بھگت رہی ہوں۔ اسی غم میں جوانی بہہ گئی۔'' میں نے اُٹھ کر اسے ایک گلاس پانی دیا اور اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھے۔ پانی کے چند گھونٹ پی کر اس کی طبیعت بحال ہوئی تو اس نے کہا۔ بابو کبھی کبھی اِدھر کا پھیرا لگاتے رہنا۔ یہاں تمہیں بہت ساری کہانیاں ملیں گی۔ زندہ یا مردہ۔'' اس کے آنسو پھر نکلنے لگے۔ شاید اس کی کہانی نے اسے پھر رُلا دیا تھا۔ میں باہر نکلنے لگا تو گوتمی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

جب کبھی میرے ذہن میں ماضی کا چاند روشن ہوتا ہے تو اس میں سے گوتمی جھانکتی ہے اور ایک بچے کے رونے کی آواز میرے ذہن میں گونجنے لگتی ہے۔ یہ آواز برسوں سے میرے تعاقب میں ہے۔

www.taemeernews.com

عکس نما

انجانی قوت کے زیر اثر یہ لوگ ہوا کی مانند کہاں جا رہے ہیں نہ معلوم منزلوں کی جانب ان کے قدم اُٹھ رہے ہیں دھوپ ہلکی ہو چکی ہے سمندر کے رُخسار چمچما اُٹھے ہیں سڑکوں پر لاتعداد موٹریں زن زن دوڑ رہی ہیں ہوا میں خنکی بڑھ رہی ہے آسمان نیلا ہے کوئی سیارہ ٹوٹ کر گرنے والا ہے آج پہلی تاریخ ہے بہت سارے لوگ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کیلئے تیار ہیں ویٹ نام کی جنگ کب کی بند ہو گئی ہے اب جنگ کا رُخ فلسطین و عراق کی طرف مڑ گیا ہے زمین انسانوں کا خون جذب کرتے کرتے تھک گئی ہے اس طرف رقص گاہ ہے اس طرف فٹ پاتھ آج کا انسان ان دونوں جگہوں میں جکڑا جا چکا ہے سمندری لہروں کی طرح انسانی احساس کرب کی لہروں میں بدل چکا ہے ہوائی جہاز آسمانوں کے قریب اُڑ رہا ہے اس میں سروے ٹیم بیٹھی ہوئی ہے ٹسٹ میچ شروع ہو چکا ہے لوگوں کا جی کام میں نہیں لگتا ان پر آسمانی سایہ ہو گیا ہے سرگوشیوں کی آواز کتنی بھلی لگتی ہے زندگی ان آوازوں سے شروع ہوتی ہے اور بلند قہقہے پر جا کر رُک جاتی ہے سامنے تھیٹر ہے بہت لمبی لائن لگی ہوئی ہے لوگ ٹکٹ لے کر پیشاب خانے کی طرف جا رہے ہیں اخبار والے شور مچا رہے ہیں امریکہ امن کیلئے جنگ کرتا ہے تم نے سنا نہیں شاید لوہا لوہے کو کاٹتا ہے ہماری جمہوریت سب سے بڑی جمہوریت ہے ہمارا ملک بہت بڑا ملک ہے غلامی سے چھٹکارا پانے کی خوشی میں لوگ جھوم رہے ہیں ذخیروں میں آگ لگ گئی ہے دہلی ہماری ناک ہے آج کل بچے بہت پیدا ہو رہے ہیں تعلیم کا ستون آسمان میں پیوست ہو گیا ہے لوگوں نے ننگے پاؤں چلنا چھوڑ دیا ہے حجاموں کی دکانیں بند ہو گئی ہیں ننگے سر پر لوگوں نے بادلوں کا سایہ کر لیا ہے ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ سوکھ گیا ہے جلوس گذر رہا ہے نعروں کی آوازیں گونج رہی ہیں ہزاروں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں کوئی یہ کہہ رہا ہے سماج کو بدلنا چاہیئے صبح کا سورج اُگ رہا ہے گھروں کی چمنیاں خاموش ہیں مریل بچے ٹوٹے ہوئے دروازوں سے رینگ رینگ کر باہر آ کر بیٹھ گئے ہیں آنکھیں ویران ویران صحرا بن گئی ہیں دور دور تک اندھیرا چھایا ہوا ہے پتہ نہیں کب روشنی ہو گی ایک اک کرن دور جا چھپی ہے بجلی فیل ہو گئی مزدور کارخانوں سے تھکے تھکے سے

www.taemeernews.com

نکل رہے ہیں شراب کھلی ہوگئی ہے چاند پر جانے کیلئے ٹکٹ مل رہے ہیں وہاں گھر بنانے کیلئے زمین بھی ملے گی ہے کوئی خریدنے والا صرف چار آنے پچیس پیسے ٹوئینٹی فائیو پیسہ لوگ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنے اپنے گھروں کو اطمینان سے جا رہے ہیں سالا جھوٹ بول کر پیسے کماتا ہے چھوٹی کار سڑکوں پر دوڑنے لگے گی سڑکیں چوڑی کی جا رہی ہے ہزاروں لوگوں کو روزگار ملے گا نور ہی نور پھیل گیا آج وزیر کی لڑکی کی شادی ہے نور میں چنوں کے ڈھیر سے لوگ کھانا چن کر اپنے پیٹ کی تھیلی میں بھر رہے ہیں ریل کی پٹریاں اکھاڑی جا رہی ہیں آگ کی لپٹیں بلڈنگوں کو اپنا حصہ بانٹ رہی ہیں شعلوں کی زبان کو کھینچ کھینچ کر سُرخ کیا جا رہا ہے بانٹ دو گھروں کو بانٹ دو کی آوازیں آ رہی ہیں زبانوں کی باتیں مت کرو ایک گھر کئی حصوں میں بٹ سکتا ہے کیا امریکہ پر حملہ ہو گیا ہندوستان مل گیا دُنیا سمٹ کر ماچس کی ڈبیا میں بیٹھ گئی ہے تاروں کا جال مٹا کر دُنیا کے ملکوں کو جوڑ دیا گیا ہے اب سمندر پاٹ کر بلڈنگوں کے سر آسمان کی طرف اُٹھائے جائیں گے ہوائی حادثہ ہو گیا پائلیٹ بچ گیا صرف دو سو ہلاک ہوئے آج کل ٹی وی پر اچھے اشتہارات آ رہے ہیں ٹیلی ویژن پر رقص ہو رہا ہے حکومت سب کچھ چھین لینے کیلئے بے چین ہے بڑے بڑے گڑھوں میں دولت جا چھپی بازار خالی ہو گئے پہلے چیزیں لوگوں کو ڈھونڈتی تھیں اب لوگ چیزوں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں ہر جگہ سے نکالے گئے تو آنکھوں نے آسمان کی طرف دیکھا تم نے سُنا ایک سال خون کی بارش ہوئی تھی اِس سال امرود برسے گا کیا گاؤں کے لوگ شہروں کی طرف جا رہے ہیں بوجھ بڑھ گیا ہے سامان اُتارنے کیلئے جگہ نہیں ہے تیسرے درجے میں مسافر بینچوں پر پاؤں پھیلائے ہوئے ہیں اُن کے اوپر سے کئی بار ٹرین گذر چکی ہے خود اُنھیں نہیں معلوم انسانی قدموں سے چاند میلا میلا سا ہو گیا ہے ویران راستے پر کوئی دکھائی نہیں دیتا بے برگ درخت آوارہ سے معلوم ہوتے ہیں تم نے آج کا ریڈیو سُنا ملک میں سکون ہے ایک جگہ بپھرے ہوئے لوگوں پر لاٹھی چارج ہو گیا اب ہمارا ملک خود کفیل ہو گیا ہے بے بھاؤ وزیر بکنے لگیں گے ابھی تو سویرا ہونے میں دیر ہے ابھی سورج سو رہا ہے کیا اُسے بھی جگانا پڑے گا نہیں ابھی کوئی ضرورت نہیں ابھی مریض تندرست ہے مرنے کیلئے اس سے اچھی جگہ کوئی نہیں ہے یہ ہاسپٹل ہے چلو نکلو اس گھر سے یہاں تو انسانوں کی بو باس آتی ہے۔ ☆☆

www.taemeernews.com

کہکشاں

مجھے اکثر سرکاری کاموں کیلئے مختلف شہروں میں جانا پڑتا ہے۔ کبھی کوئی شہر دیکھا بھالا ہوتا ہے۔ کبھی اجنبی۔ میں جب کبھی اجنبی شہر میں اجنبی بن کر جاتا ہوں تو اُس شہر کی نبض تلاش کرتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کے انسانوں کی طرح شہروں کی زندگی ہوتی ہے، اُن کا دل دھڑکتا ہوا ہوتا ہے، اُتار چڑھاو ہوتے ہیں، صحت و بیماریاں ہوتی ہیں، خوبصورتی اور بدصورتی ہوتی ہے، اچھائیاں اور برائیاں ہوتی ہیں۔ صاف ستھری نہریں، تالاب اور گندی نالیاں، گندگی میں بسے جوہڑ ہوتے ہیں۔ ان جوہڑوں میں کالی کالی بھینسیں بیٹھی ہوتی ہیں اور آوارہ کتے اور کتیاں اُن کے اطراف گھومتے رہتے ہیں۔ ان جوہڑوں کے اِردگرد سڑانڈ پھیلی ہوتی ہے اور اطراف میں جھوپڑ پٹیاں ان جوہڑوں کو یوں گھیرے کھڑی ہوتی ہیں جیسے ان گندے جوہڑوں کی حفاظت کیلئے قلعہ بندی کر رہی ہوں۔

آج میں جس شہر میں پہنچا تھا وہ بھی اور شہروں کی طرح تھا لیکن میرے لئے اجنبی تھا۔ میں صبح آفس کے وقت پر اپنی آفس پہنچا تو آفس میں صاف صفائی ہو رہی تھی۔ خاکی وردی میں سپاہی جٹے ہوئے تھے۔ ایک نے مجھے گھور کر دیکھا، اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ ''اتنی جلدی آگئے۔ ابھی تو چھوٹا صاحب بڑا صاحب نہیں آئے۔'' میں آفس کے برآمدے میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ قریب پندرہ منٹ بعد ایک کلرک نما آدمی ہانپتا کانپتا آیا۔ مجھے نظر بھر کر دیکھا۔ پھر میرے قریب آکر بیٹھ گیا اور بڑبڑانے لگا۔ ''یہ بھی کوئی جیون جینا ہے۔ روز بس پکڑو، پھر ٹرین میں دھکے کھاؤ۔ کچھ دور لیفٹ رائٹ کرو۔ پھر آفس پہنچو۔ دیر ہو ہی جاتی ہے۔ وہ جن کے پاس کار ہے۔ وہ جو بڑے آرام سے گھر پہنچتے ہیں اور گھر سے نکلتے ہیں وہ بھی دھکے ڈھکے کھائے بناء دیر سویر سے ہی آتے ہیں۔ ہماری کیا اوقات۔ ہمیں تو اور لیٹ ہونا چاہیئے ------'' پھر وہ خاموش سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ میں ہنکارا بھر کر اُس کی تائید کروں۔ میری خاموشی اُس کو گراں گذر رہی تھی۔ میں نے اُسے خوش کرنے کیلئے کہا۔ ''ہاں! تم سچ کہہ رہے ہو۔ بڑے لوگ ساری ذمہ داری چھوٹے لوگوں پر ڈال کر اپنی ذمہ داریوں سے

www.taemeernews.com

فرار حاصل کر لیتے ہیں ۔ ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ گھر میں بھی اور باہر بھی۔ تمہاری باتوں میں بہت دم ہے۔'' اُس کی آنکھوں میں کرن سی لہرائی۔ اُس کے ہونٹ ذرا سی مسکراہٹ میں ہلے۔ پھر وہ کہنے لگا۔'' آج گیارہ بجے میٹنگ تھی۔ سب کو اطلاع کر دی گئی تھی۔ اب تم جیسے آجائیں گے ہمارا بھیجہ چاٹنے۔ بڑی مغز پچی ہوگی۔ مگر بڑا صاحب آرام سے اپنی سالی کو لانے ایئر پورٹ جائے گا۔ اب اُس نے میٹنگ چھ بجے رکھی ہے۔''

میں چونکا۔ گیارہ کا چھ ہو گیا۔ سارا دن بے کار جائے گا۔ ابھی ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے کہ ہاتھ میں بیگ لٹکائے ایک ہیڈ کلرک نما آدمی پسینہ پسینہ، لہراتا، بل کھاتا آیا۔ اُسے دیکھ کر کلرک اُس کا بیگ لینے لپکا۔ ابھی اُس کا ہاتھ بیگ تک پہنچا نہیں تھا کہ اُس کی طرف ایک سپاہی جھپٹا اور ہیڈ کلرک کے ہاتھ سے بیگ جھپٹ لیا۔ کلرک نے چنگاری بھری آنکھوں سے سپاہی کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہوں۔'' ابے پاؤں بھی چھو لیتا۔ سالے اتنی چاپلوسی دن بھر کی کمائی میں حصہ لینے کیلئے ہے۔ یہ سب چونچلے بہت ضروری ہیں۔'' پھر وہ صاحب کے پیچھے آفس میں چلا گیا۔ ہیڈ کلرک نے جاتے جاتے ایک نگاہِ غلط انداز میرے اوپر ڈالی اور مجھے نہ چھیڑ کر مصیبت ٹالنے کے انداز میں آفس کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

چند منٹ بعد میں بھی آفس میں داخل ہوا۔ ہیڈ کلرک کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ کر میں نے اپنی بیگ سے ضروری کاغذات نکالے اور ٹیبل پر رکھ دیئے۔ ہیڈ کلرک نے میری طرف یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے کاغذات اور مجھے ایک ساتھ نگل لینا چاہتا ہو۔ پھر کہنے لگا۔'' ساری مصیبت ہم پر ہی آجاتی ہے۔ آٹھ دن تک آج کی میٹنگ کیلئے کام کرنا پڑا۔ بڑے صاحب کی سالی آ ٹپکی۔ اب پتہ نہیں چھ کو بھی ہوتی کہ نہیں۔ معلوم نہیں۔ سالے! یہ سالے سالیاں کہاں سے آجاتے ہیں۔ سارا کام چوپٹ ہو جاتا ہے۔ اب صاحب کا فون آئے گا۔ میٹنگ کل رکھو۔ بس اب تم لوگ بھی آنے لگے ہو۔ گھسنے لگیں گے۔ ۔۔۔۔'' میں نے بیچ میں ہی کہہ دیا۔'' میں نے تو ابھی تک ایک لفظ نہیں نکالا۔''

'' ہاں! تمہاری زبان بند ہے مگر آنکھیں تو بولتی ہیں۔ شکایت کرتی ہیں۔ میں نے اس کرسی پر بیٹھ کر اوپر والوں سے لے کر نیچے والوں کی آنکھیں پڑھنا سیکھ لیا۔ آنکھیں پڑھ کر ہی میں بات کرتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں جو سوالات اُبھر آئے ہیں اور بیزاری بھی، وہ میں نے پڑھ لئے ہیں۔ اب تم جاؤ شہر گھومو پھیرو۔ چھ بجے آؤ۔ یہاں سے تھوڑی دور خوبصورت گارڈن ہے۔ وہاں کی سیر کرو۔ فلم دیکھو۔ مست وقت گذارو۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا تو اُس کے ہونٹوں پر چٹکی بھر مسکراہٹ اُبھری۔ اُس نے

www.taemeernews.com

میرے لائے ہوئے کاغذات کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پوچھا۔ ''اس شہر میں پہلی بار آئے ہو؟ گارڈن کے بازو میں ایک تھیٹر ہے۔ دو سے ساڑھے پانچ اچھا وقت گذرے گا۔''

میں ایک جھٹکے سے اُٹھا۔ یہ جھٹکا ایک خاموش احتجاج بھی تھا۔ اتنی دور سے میٹنگ کے لئے بلائے جانے اور میٹنگ نہ ہونے پر اِس کے سوا ایک ملازم کیا کرسکتا ہے؟ میں کبھی کبھی اپنے آپ کو بندھوا مزدور سمجھنے لگتا ہوں۔ بندھوا مزدور جو بڑے بڑے زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرتا ہے لیکن میں سوچتا ہوں وہ کتنا سکھی ہوتا ہے۔ کم سے کم بغیر کسی دباؤ کے، بغیر کسی تناؤ کے کھلی فضاء میں سانس لے کر صحت بھی قائم رکھتا ہے اور کام سے تھک کر پاؤں پسار کر کسی بھی درخت کے تنے کو تکیہ بنا کر زمین کے بستر پر سو جاتا ہے۔ میرے جیسے لوگوں کا معاملہ الگ ہے۔

میں جب باہر نکلا تو دھوپ میں تمازت بھر رہی تھی۔ وقت بھی ایسے وقت دشمنی پر اُتر آتا ہے۔ کٹتے نہیں کٹتا۔ چیونٹی کی چال بھی وقت کے لئے کم محسوس ہوتی ہے۔ میں نے آفس سے نکلتے وقت گھڑی پر نظر ڈالی تھی۔ دونوں سوئیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اب جب کہ میں کافی دور چل نکلا تھا۔ تب بھی وہ ایکدوسرے کو چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک آدمی سے گارڈن کا راستہ پوچھا اور اُس کے بتائے ہوئے راستے پر ہولیا۔

گارڈن بہت پر بہار تھا۔ روِشوں پر ہری ہری دوب تھی۔ صبح کے وقت پانی چھڑکنے کی نمی ابھی تک تھی۔ میں نے جائزہ لیا۔ نوجوانوں کی بھیڑ نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر سبکدوش بوڑھے، بوڑھیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُن کے درمیان میں اجنبی سا لگتا تھا۔ میں ایک گوشے میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

میں چاہتا تھا کہ ساری کلفت یکسر بھلادوں۔ اس لئے آنکھیں بند کر کے بینچ سے سر ٹکا دیا اور بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں اکثر ایسا کرتا ہوں۔ ذہن کو بھی خالی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس طرح بدن کی تھکاوٹ دور ہو جاتی اور جھنجلاہٹ بھی کم ہو جاتی۔ ابھی چند لمحے ہی گذرے تھے۔ پوری طرح کلفت سے آزادی نہیں ملی تھی کہ مہین آواز نے مجھے آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ''صاحب کتنا بجا؟''

سامنے ایک قبول صورت عورت کھڑی مجھ سے وقت پوچھ رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے جواب دیا۔ ''ساڑھے بارہ بجے ہیں۔'' وہ نہیں، ہاں کے انداز میں قدم اُٹھاتی جانے لگی۔ میں نے پھر آنکھیں موند لیں اور پہلے کی طرح بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں جاتی ہوئی عورت کا ہیولا تیرنے لگا۔ وہ قبول صورت تھی لیکن بدن کمزور تھا۔ سینے کا اُبھار بدن کی خوبصورتی میں معمولی سا اضافہ کر رہا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ ''بے چاری جوانی میں ہی ادھیڑی کی دہلیز پر پہنچنے کے لئے پر

www.taemeernews.com

تول رہی ہے۔ ہمارے اِردگرد ایسی عورتوں کی کمی نہیں جو یا تو شوہروں کی ماری ہیں یا پھر سماج کی جکڑ بندیوں میں جی کر اپنے آپ کو ہلکان کر لیتی ہیں۔ یہ بھی اسی قبیل کی معلوم ہوتی ہے۔ میری سوچ آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک رُکاوٹ پیدا ہوگئی۔ پھر وہی مہین آواز اُبھری۔ ''صاحب کتنا بجا؟''

میں نے آنکھیں کھول دی تو وہ ہیولا، سالم میرے سامنے تھا۔ میں کچھ جز بز ہو کر بولا۔ ''ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گذرے کے تم پھر وقت پوچھنے آگئیں۔ پہلے جو بتایا تھا اُس میں پانچ منٹ جوڑ لو۔''

وہ بھی شاید میرے جیسی وقت کی ماری تھی۔ میرا بھی وقت کٹتے نہیں کٹ رہا تھا۔ اُس کا بھی شاید یہی حال تھا۔ وہ بھی کچھ اضطرابی کیفیت لیئے ہوئے تھی۔ میری سوچ کے پر پھر پھڑ پھڑانے لگے۔ ایسی عورتیں مردوں کو پھانسنے کیلئے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرتی ہیں۔ اس عورت نے وقت معلوم کرنے کا بہانہ تلاش کر لیا ہے۔ کہیں یہ مجھے پھانسنے کا چکر تو نہیں؟ میں پھنسنے کیلئے بھی تیار رہتا ہوں۔ اکثر دوروں کے درمیان مجھ پر پھنسنے کے دورے بھی پڑتے ہیں لیکن انجانی جگہوں پر میں بہت محتاط رہتا ہوں لیکن کبھی کبھی یہ محتاطی بھی رفو چکر ہو جاتی ہے۔

میرے سامنے گذشتہ برس کے واقعات ہوا کے جھونکے کی طرح آنے لگے۔ ایسا ہی کچھ وقت گذاری کا معاملہ تھا۔ وہ شہر میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ دیکھا بھالا تھا۔ وہاں کچھ دوست احباب بھی تھے۔ میں اپنا کام نپٹا کر اُن سے ملنا بھی چاہتا تھا کہ میرا سارا وقت ایک حسین قیامت لے اُڑی تھی۔ اُس کی یاد اکثر آتی ہے تو میں ڈوب ڈوب جاتا ہوں۔ اس لمحہ بھی اُس کی یاد ذہن کے کسی دریچے سے اُتر آئی تھی۔ میں اُس کی یاد میں کھو کر وقت کاٹ رہا تھا کہ پھر آواز آئی۔ اس مرتبہ وقفہ پہلے کی بہ نسبت کچھ طویل تھا۔

''اب کتنا بجا؟'' وہ وقت پوچھ کر یوں مسکرانے لگی جیسے میری اُس کی شناسائی برسوں پرانی ہو۔ اُس کی مسکراہٹ میں قربت کی کشش معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے وقت نہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''بار بار وقت پوچھ رہی ہو۔ کیا آفس جانا ہے یا پھر کسی سے اپوائنٹمنٹ ہے؟'' اُس کی آنکھیں اور ہونٹ ایک ساتھ مسکراتے محسوس ہوئے۔ اُس نے بڑی لگاوٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دونوں باتیں غلط۔ مجھے فلم دیکھنے جانا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی ساتھی مل جائے۔ بغیر ساتھی کے فلم میں مزہ نہیں آتا۔ دن کا وقت کاٹنا بہت مشکل ہے۔ فلم وقت کاٹنے کا اچھا ذریعہ ہے۔''

میں نے اُس کے خط و خال کو پہلی بار جانچنے کے انداز میں دیکھا۔ اُس کی قبول صورتی اور بدنی خوبصورتی میں پہلے کی بہ نسبت میری آنکھوں نے اضافہ ہی دیکھا۔ میں وقت بتانے کیلئے گھڑی پر نگاہیں ڈال ہی رہا تھا کہ وہ میرے بازو میں آکر بیٹھ گئی۔

www.taemeernews.com

میں نے کہا۔ ''اب تمہیں وقت بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے بھی فلم دیکھنے جانا ہے۔ یہاں بیٹھ کر انتظار کرو۔ وقت ہونے پر ساتھ ساتھ چلیں گے۔''

اُس نے کہا۔ ''ابھی کافی وقت باقی ہے۔ پھر بھی تمہارا ساتھ رہا تو کٹ ہی جائے گا۔''

''جب دن کا وقت تم پر بھاری گذرتا ہے تو رات کتنی بھاری ہوتی ہوگی؟'' میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ ہنسی اور کہنے لگی۔ ''صاحب رات تو مزے مزے سے کٹ جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی وقت خرید لیتا ہے۔ پھر نشے میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ دن ہے کہ رات۔ وقت خریدنے والا بھی مست مست ہو جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ مرد ہے کہ عورت ہے۔ رات کے وقت میں اُس کی قید میں ہوتی ہوں لیکن صبح پنچھی کی طرح آزاد۔ کسی کو نئے جال میں پھانسنے کیلئے تیار۔'' وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔ اُس کی بے تکلف باتوں نے مجھے پوری طرح بیدار کر دیا اور اُس کی قربت سے میری کلفت بھی دور ہونے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''کرتی کیا ہو؟''

اُس کی آنکھیں ایسی پھیلیں جیسے وہ مجھ پر غصہ اُتارنا چاہتی ہو۔ پھر اُس نے ذرا کھنکھناتے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اب تک جو کچھ کہا۔ اُسے تم نے بکواس سمجھا کیا؟'' اُس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

میں نے اُس کے کہے ہوئے الفاظ پر غور کیا تو مجھے اپنی نا سمجھی پر ہنسی آئی۔ اُس کی باتوں سے صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ روز کنواں کھودنے اور روز پانی پینے والی زندگی گذار رہی تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے ہی رومانٹک لہجے میں کہا۔ ''اب میری سمجھ میں آیا تم فری لانس ورکر ہو۔'' اُس نے کہا۔ ''ورکر میں تم کچھ اور بھی جوڑ سکتے ہو۔'' وہ کس لفظ کو جوڑنے کیلئے کہہ رہی تھی اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اُس نے اب میری طرف پوری طرح متوجہ ہو کر پوچھا۔ ''اس شہر میں نئے معلوم ہوتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟'' میں نے اپنے آپ کو سمیٹ لیا۔ سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اُسے سچ بتا دوں اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے مجھے لوٹ لے۔ میں نے بناوٹی باتیں بتانی شروع کر دی۔ ''اجنبی تو نہیں ہوں۔ یہاں میرا آفس ہے۔ آفس کے کام سے چھٹی مل گئی ہے۔ باس اپنی سالی کو لانے ایئرپورٹ گیا ہوا ہے۔ سوچا ذرا کھلی ہوا میں سانس لے کر ذہن کا بھاری پن دور کر لوں۔ یہی سوچ کر یہاں آیا تھا کہ تم آ دھمکیں اور وقت کا چکر چلا کر مجھے قید کر لیا۔''

میرے بتانے پر وہ یوں چونکی جیسے اُس کے ذہن میں میرے بارے میں جو کچھ تھا میں نے

www.taemeernews.com

اُس کے برخلاف بتایا ہو۔اُس کی آنکھوں میں میں نے پڑھ لیا کہ وہ دوسری بات سوچ رہی ہے۔اُس نے دھیرے سے کہا۔"فلم کے لئے کافی وقت ہے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے بور ہو جائیں گے چلو کہیں چائے پی لیں۔"

اُس کی تجویز معقول تھی۔ میں اُٹھ گیا۔ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ چلتے چلتے وہ مجھ سے ایسے سٹ گئی کہ اُس کے بدن کا لمس مجھے چھونے لگا۔گارڈن سے باہر نکلنے کے بعد میں نے کہا۔"چلو کسی اچھی سی جگہ جہاں اچھی چائے ملتی ہو۔ میں نے صبح صرف ایک پیالی چائے پی ہے۔اب تم ساتھ ہوگئی ہو تو اچھی چائے پینے کی للسا جاگ اُٹھی ہے۔" اُس نے کاٹتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور قریب ہوتے ہوئے کہا۔"صرف چائے پینے کی للسا؟"

میں نے جواب دیا۔"فی الحال یہی ایک خواہش جاگی ہے۔ کسی اور خواہش کے بارے میں میرا ذہن خالی ہے۔تمہارے لمس نے کسی اور خواہش کو ہوا دی تو بتا دوں گا۔

اُس کا انداز ایسا تھا کہ اُسے میری باتوں پر یقین نا ہو رہا ہو۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں کچھ چھپا رہا ہوں یا ہو سکتا ہے اُسے ان لوگوں سے سابقہ پڑا ہو جو جلد پگھلنے والے رہے ہوں۔ میں عورتوں کے تعلق سے ہمیشہ کولڈ رہا ہوں۔

ہم دونوں نے ایک ہوٹل میں چائے پی۔ میں نے بل ادا کیا اور کہا۔"چلو پھر گارڈن میں بیٹھتے ہیں۔" اُس نے بہت ہی دُلار بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔"اتنا اچھا وقت گارڈن میں کاٹنے سے اچھا ہے کسی اور جگہ کاٹا جائے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔"گارڈن سے اچھی جگہ ہو تو چلو میں چلنے کیلئے تیار ہوں۔"

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر میرے کولڈ پن کو گرمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"میری کھولی یہاں سے دور نہیں ہے۔ وہاں تم فریش بھی ہو سکتے ہو۔" بولتے وقت اُس نے لفظ فریش پر رومانٹک زور دیا تھا لیکن میرے اندر اُس کے ساتھ جانے کی تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی میرا جسم لاتحریکی اختیار کر لیتا ہے یا پھر میرے ذہن میں لاتحریکی در آتی ہے۔

میں نے اُس کا ہاتھ دور کرتے ہوئے کہا۔"رات کی کسلمندی میں صبح فریش ہو کر اُتارتا ہوں۔ دن ہی دن فریش ہونا میرے لئے اچھا نہیں ہے۔" وہ مسکرائی اور بولی۔"صاحب! جب ہم کھولی میں جائیں گے نا تو دن اور رات کا فرق ہی ختم ہو جائے گا۔ نا کھڑکی نا پردہ بس ایک دروازہ۔ دروازہ بند رات دن کا مسئلہ ختم۔ وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اپنی ہنسی میں مجھے جکڑ لینا

www.taemeernews.com

چاہتی ہو۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو! ابھی چھ بجے ہیں میرا باس میٹنگ لے گا۔ میٹنگ کب تک چلے گی پتہ نہیں۔ اگر میٹنگ میں نا جاؤں تو تمہیں معلوم ہے کیا ہوگا؟ مصیبت۔ صاحب ہفتہ بھر نا آئے چلے گا۔ مگر سرونٹ پانچ منٹ لیٹ ہو جائے نہیں چلے گا۔ نوکری ایسی ہی ہوتی ہے۔ تم اچھی آزاد پنچھی ہو۔ نا کسی کا ڈر نا خوف۔ کسی کی نوکری نا چاکری۔ اُلٹے مجھ جیسے کمزور مردوں سے اپنی نوکری کروالیتی ہو۔

اُس نے اپنے اوپر مصنوعی غصہ طاری کرلیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ غصہ پیار بھرا ہے۔ وہ کہنے لگی۔ ''کب سے میں تم کو مسکا مار رہی ہو لیکن تم پھسل ہی نہیں رہے ہو۔ میں نے بہت سے مرد دیکھے ہیں کئی تو صرف میری مسکراہٹ پر ہی پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ کوئی میری چال پر مرمٹتا ہے۔ کسی نے میری آنکھوں کے اشارے پر ہی اپنا سب کچھ لٹا دیا اور ایک تم ہو کے ابھی تک بدھو نہیں رہے ہو۔ ایسے سخت جان مردوں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں ایسے مردوں کو پسند کرتی ہوں جو جلدی سے پگھل کر چند ہی لمحوں میں دیا کل ہو جائیں پھر تھکے تھکے قدموں سے اپنی راہ لیں لیکن ایک تم ہو کہ گرما گرم چائے اور نرما نرم باتوں سے بھی پتھر بنے ہو۔''

میں نے بڑے ہی فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''میڈم! سمئے سمئے کی بات ہوتی ہے۔ مجھ جیسا آدمی وقت بے وقت نہیں پگھلتا۔ ایک کام کرتے ہیں۔ ہم فلم دیکھنے چلتے ہیں۔ اُس کے بعد میں میٹنگ میں چلا جاؤں گا۔ تم تمہاری کھولی کا پتہ بتا دو۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا لیکن تمہیں میرا انتظار کرنا پڑے گا۔

''نا بابا نا۔ انتظار تو اس بندی نے سیکھا ہی نہیں۔ اگر انتظار کی تاب میرے اندر ہوتی تو آج میں ٹھوکریں کھاتی نا پھرتی۔'' اُس نے بے تابی سے ہاتھوں کو ملا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

باتیں کرتے کرتے ہم پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ گارڈن کا ابھی تک وہی ماحول تھا جو ہم چھوڑ گئے تھے۔ اُس کی باتوں نے مجھے کرید پر اُکسا دیا تھا۔ میں نے سوچا ایسی عورتیں اپنا حال سب کو سچ بتاتی نہیں۔ پھر بھی اس عورت کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی سچ بول دیتی ہے۔ میں نے اُس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے تم پڑھی لکھی ہو۔ تمہاری باتیں دلچسپ بھی ہیں اور دوسری عورتوں سے الگ بھی۔ میں تمہارے بارے میں پہلے غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا لیکن اب میرا من صاف ہو گیا ہے۔''

اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر گرمانے کے انداز میں دباتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا انداز غلط نہیں ہے۔ میں نے ہائی اسکول سے نکل کر چند دن کالج میں گذارے ہیں۔ میرے گھر اور محلے کا

www.taemeernews.com

ماحول صاف ستھرا اور اچھی بول چال کا تھا پر میں ہی ابھاگی، مجھے کہیں چین نہیں آتا تھا۔ اب بھی میں جلد سے جلد اپنی عمر گذار کر موت کے منہ میں پہنچ جانا چاہتی ہوں اس لئے بے چینی اور بے کلی میرے اندر تک اُتر آئی ہے۔ اس وجہ سے اپنوں سے دور ہوں۔ گھر والوں نے بڑے آدمی سے شادی بھی کردی تھی۔ مگر تم کیا جانو۔ بے کلی کیا ہوتی ہے۔ وہ بڑا آدمی دن رات آنکڑے توڑتا۔ اربوں کھربوں کا حساب جوڑتا لیکن میری بے کلی کو نہیں توڑ پاتا وہ موم کی طرح جمنے والا اور میں پارے کی طرح پگھلنے والی بے جوڑ۔ میں اُکتا گئی۔ روشن زندگی سے اس اندھیری زندگی میں آگئی اور پرانی زندگی میں بھول گئی۔ اب میں محسوس کرتی ہوں کہ میں میری اپنی ہوں۔ اس پر کسی کا کوئی حق نہیں۔ موم کی طرح جموں گی تو میں، پارے کی طرح پگھلوں کی تو میں۔ شروع شروع میں جب میرے بدن میں کساؤ شروع ہوا تو میں کالج کے لڑکوں ،اُستادوں کی آنکھوں میں جھانک کر اُنہیں پڑھنے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ کیا کہتی ہیں۔ لڑکوں کی آنکھوں میں پیار نظر آیا لیکن ادھیڑ بوڑھوں، کھوسٹوں کی نگاہوں میں ہوس نظر آئی۔ کئی لڑکوں سے ٹائم پاس محبت بھی کی لیکن پھر بھلا دیا۔ میں چاہتی تھی کہ زندگی ہر لمحہ کچھ نت نیا کھیل کھیلے اور اسی بری عادت نے مجھے کہیں چین لینے نہیں دیا۔ اب بدن ڈھیلا ہونے لگا ہے تو روز کنواں کھودو اور روز پانی پیو والا دور آگیا ہے۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''اور ایک سچی بات بتادوں۔ میں دراصل ویسی نہیں ہوں جیسی تمہیں دکھائی دے رہی ہوں۔ آج کل مجھے ایک مافیا گینگ نے پھانس رکھا ہے۔ یہ مافیا والے تم جیسے اجنبی لوگوں کو گھیر گھار کر لانے کے لئے کہتے ہیں۔ پھر اُنہیں لوٹ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی مار پیٹ بھی کرتے ہیں۔ تم مجھے شریف آدمی معلوم ہوئے اسلئے تمہیں بتا رہی ہوں۔ اچھا ہوا کہ تم اور مردوں کی طرح راضی نہیں ہوئے۔ اب تم ایک کام کرنا۔ ہم فلم دیکھنے چلیں گے۔ تم بالکل محتاط مت ہونا۔ ہنستے مسکراتے رہنا۔ ایسے جیسے تم مکمل طور پر میرے جال میں پھنس گئے ہو۔ انٹرویل پر ہم چائے پینے باہر آئیں گے پھر اندر چلے جائیں گے۔ فلم چھوٹنے سے آدھا گھنٹہ پہلے تم کھسک لینا۔ سمجھے!''

میں نے اُس کی ہدایت پر سختی سے عمل کیا۔ اُس کے ساتھ ایسے سٹ کر چلنے لگا جیسے میں اُس کے جال میں پوری طرح پھنس چکا ہوں۔ دیکھنے والوں کو ایسا ہی محسوس ہو اس لئے میں اُس کی باتوں پر ہنستا مسکراتا ہوا اُس کے ساتھ فلم دیکھنے کیلئے چلا گیا۔ انٹرویل پر ہم دونوں باہر ہنستے مسکراتے باتیں کرتے باہر نکل کر چائے کے اسٹال پر آئے۔ چائے پی۔ پھر تھیٹر میں چلے گئے۔ فلم چھوٹنے سے آدھا گھنٹہ پہلے میں نے اُس کے ہاتھوں کو گرمجوشی سے دباتے ہوئے ایک سو کا نوٹ بھی اُس کے ہاتھوں میں رکھ دیا اور

www.taemeernews.com

اندھیرے میں باہر نکل آیا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے اندھیری رات میں اس عورت کے دل کی دھڑکن کیساتھ بہت ساری اچھائیاں جھانک کر رہی ہیں۔ ☆☆☆

☆ مصنف کی شائع شدہ کتابیں ☆

☆ افسانوی مجموعے

(۱) اپنے آپ کا قیدی — 1975 بہار اشٹر اُردو اکیڈمی سے انعام یافتہ

(۲) رات کا منظر — 1981 بہار اشٹر، بہار، امیر حیدر اکیڈمی گیا بہار سے انعام یافتہ

(۳) اپنی مٹی — 1990

☆ ناول

(۱) زندگی تیرے لیے — 2004

☆ بچوں کے لیے

(۱) موتی کی واپسی — 1998

(۲) نوٹ کے پودے — 2006

☆ زیرِ ترتیب

بچوں کے لیے

(۱) روشنی کی دوڑ

☆ ناول

(۱)

Short Stories Collection "Quafas"

By Ahmed Usmani

☆ "آپ کے طرزِ تحریر اور پیشکش کے انداز نے متاثر کیا۔ بہت دنوں بعد ایسا جاں فزا، دلکش ناول پڑھنے کو ملا۔ مبارکباد دیتا ہوں"

ڈاکٹر محمد حسن، دہلی

☆ "آپ نے موضوع کے اعتبار سے بہت جرأت مندانہ تجربہ کیا ہے۔ اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

شمس الرحمٰن فاروقی، الٰہ آباد

☆ "بہت دن بعد ایسا ناول پڑھنے کو ملا جس میں آرائشِ بیان کی کوشش نہیں ہے۔ راست بیانیہ ہے اور اپنے ماحول کی بہت اچھی عکاسی کرتا ہے، مرکزی کردار "سندر" بہت خوب ہے۔"

نیّر مسعود، لکھنؤ

☆ "آپ کا ناول دلچسپ ہے، کردار اور واقعات، مواد اپنی جگہ خوب ہیں۔ ناول کے بعض حصے بلاشبہ گہری اہمیت کے حامل ہیں۔ خصوصاً مزدوروں کی بستی، ان کی غربت زدہ زندگی، مجبوریاں، محرومیاں اور اخلاقی اقدار کو آپ نے بڑی چابکدستی سے قلم بند کیا ہے۔

جتیندر بلو، لندن

☆ "زندگی تیرے لئے" انسانی نفسیات کے ایک خوبصورت موڑ کی کہانی ہے۔ محبت وہ خوشگوار جھونکا ہے جو آدمی کے دل پر ایک بار ضرور دستک دیتا اور کبھی اس کی زندگی میں دبے پاؤں یا دَر آنہ چلا آتا ہے، پھر زندگی کی شاہراہ پر پھول اور کانٹے دکھ سکھ کے روپ میں اس کے ذہن و دل میں ایک ہلچل سی مچا دیتے ہیں۔ احمد عثمانی کی یہ کہانی بھی حیرت، محبت اور دکھ کے جذبات سے لبریز ہے۔"

سلیم شہزاد، مالیگاؤں